تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

اہم اعلان

مولانا امین احسن اصلاحی کی درج ذیل معرکۃ الآراء تصانیف کے مکمل نظرثانی شدہ جدید ایڈیشن الحمدللہ شائع ہو گئے ہیں:

- دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار ۳۳/- روپے
- حقیقتِ نماز ۱۸/- روپے ○ حقیقتِ تقوٰی ۱۸/- روپے
- حقیقتِ شرک و توحید ۵۶/- روپے
- مبادئ تدبرِ قرآن ۳۶/- روپے
- قرآن میں پردے کے احکام ۴/- روپے
- اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام ۳۶/- روپے

علاوہ ازیں ان کی مندرجہ ذیل کتب بھی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں جو ان شاءاللہ جلد دستیاب ہوں گی:

- تزکیۂ نفس۔ جلد دوم
- مبادئ تدبرِ حدیث
- اسلامی قانون کی تدوین
- اسلامی ریاست
- مجموعہ تفاسیرِ فراہی
- مقالاتِ اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن
۱۲۲۔ فیروزپور روڈ لاہور ۵۴۶۰۰
فون: ۲۷۳۴۷۷

سلسلہ نمبر ۲۸ شوال ۱۴۰۹ھ مئی ۱۹۸۹ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

مسلم اُمّت کی بیداری ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۃ انعام (۳) ——— خالد مسعود ۹

اسالیبِ قرآن ——— خالد مسعود ۱۶

تدبرِ حدیث

زکوٰۃ (۲) ——— امین احسن اصلاحی/سعید احمد ۲۲

افاداتِ فراہی

حکمتِ قرآن (۷)

نظامِ دین کی حکمت ——— خالد مسعود ۳۰

بحث و نظر

قدامت پرستی کا کیا جنون ہے یہ؟ ——— ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی ۳۹

مجلسِ ترتیب

- —— خالد مسعود (مدیر)
- —— عبداللہ غلام محمد
- —— ماجد خاور
- —— محبوب سبحانی

ناشر : —— ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور ۲۵

مطبع : —— المطبعة العربيّة ، لاہور

قیمت ۵/= روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

مسلم اُمّہ کی بیداری

دُنیا کے نقشہ پر نگاہ ڈالیے تو جو چیز دامنِ دل کو کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تین برِ اعظموں —— ایشیا، افریقہ اور یورپ —— کے سنگم کے علاقے، مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی و وسطی ایشیاء کے متعدد ممالک، افریقہ کے شمالی و وسطی علاقے اور بحرالکاہل کے اہم جزائر مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں اور بالعموم ان علاقوں میں مسلمان یا تو واضح اکثریت سے ہیں یا ایک ایسی اقلیت ہیں جس کو خاطر میں نہ لانا وہاں کی اکثریت کے بس میں نہیں۔ ان علاقوں میں نہایت اہم آبی گزرگاہیں اور بحری درّے واقع ہیں جن کی عالمی دفاعی حکمتِ عملی میں زبردست اہمیت ہے۔ اس مسلم خیز خطۂ اراضی کے ممالک نے ایک قابلِ قدر سیاسی اقدام یہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو اسلامی ممالک کی تنظیم کی عالمی برادری میں شامل کر لیا ہے۔ یہ تنظیم فی الوقت زیادہ مضبوط نہ سہی، لیکن اس کے مضمرات ایسے ہیں جو ان قوتوں کی نیندیں حرام کر رہے ہیں جو اسلام کی حتمی شکست کو بس چند سالوں کا معاملہ سمجھ بیٹھی تھیں۔ دوسری اہم بات جو عالمِ اسلام کی ایک عمومی خصوصیت بن کر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اس میں سیاسی و سماجی دائروں میں متعدد ایسی کوششیں ہو رہی ہیں جن کا مطمحِ نظر اسلام کی سربلندی کی جدوجہد ہے۔ ان کی کمیت و کیفیت ہماری نگاہوں میں خواہ کس قدر حقیر ہو اسلام دشمن قوتوں کے لیے یہ نہایت پریشان کن ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ سے لے کر اب تک یورپ نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اسلام کو ایسی زک پہنچائی جائے کہ یہ دین دوبارہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔ ان کو اس میں بڑی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ ہسپانیہ اور سسلی سے انہوں نے مسلمانوں کو بے دخل کیا اور آج بھی البانیہ، رومانیہ، یوگوسلاویہ اور ہنگری سے وہ ان کا نام و نشان مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عالمِ اسلام کو نوآبادیاتی نظام میں جکڑ لیا اور اس میں تعلیمی اور معاشرتی میدانوں میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کے نتیجہ میں لوگ خواہ عیسائی

نہ ہوں لیکن مسلمان بھی نہ رہیں۔ پھر انہوں نے مسلمان ممالک کے قلب میں اسرائیل کی طرح کے ایسے سیاسی خنجر پیوست کیے جو ان کو کسی پہلو چین نہ لینے دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی تدبیر اسلام کی قوت کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکی بلکہ اس وقت خود مغربی ممالک میں اسلام اپنے قدم جما رہا ہے۔ فرانس میں مسلمان عددی لحاظ سے دوسری بڑی قوت ہیں۔ ان ممالک میں خود وہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

۱۸۶۲ء میں کالج دی فرانس کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرانس کے ایک تاریخ دان ماہر لسانیات پروفیسر ارنسٹ رینان (ERNEST RENAN) نے یہ کہہ کر مغربی دنیا کے اسلام کے بارے میں جذبات کی صحیح غمازی کی تھی کہ "اسلام ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ یہ سائنس کا منہ چڑاتا ہے۔ مہذب سوسائٹی کی راہ روکتا ہے۔ یہ سامی ذہن کی سادہ لوحی کی علامت ہے۔ اس ذہنیت نے انسانی دماغ کو پچکا کر رکھ دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ہر ترقی یافتہ تصور، ہر لطیف احساس اور ہر عقلی تحقیق کے لیے بند ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ "خدا ہی خدا ہے" کی رٹ لگاتے ہوئے اسی کی عبودیت میں جکڑے رہیں"۔ اسلام کے خلاف دل کی بھڑاس اس طرح نکال کر رینان نے اسلام کے جلد خاتمہ کی نوید یوں سنائی کہ "بنو اسماعیل کا آخری فرزند بہت جلد یا تو خود فقر و فاقہ سے مر جائے گا یا اس کو خوفزدہ کر کے صحرا کی پہنائیوں کی طرف بھگا دیا جائے گا"۔ جو لوگ اسلام کے مستقبل کے بارے میں اس طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے ہوں ان کے لیے یہ حقیقت کس قدر بھیانک ہو گی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد امارت کی ان حدوں کو چھوئے جس کا تصور بھی مغرب کے سرمایہ داروں کے لیے مشکل ہو اور وہ یورپ اور امریکہ کے بزرجمہروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے اور ان کی پالیسیوں کے نفاذ میں سدِ راہ بن جائے۔

یورپین اقوام کے اسلام دشمن اقدامات اور مسلم کش پالیسیوں کے باوجود جب مسلم امہ افتاں و خیزاں اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آئی اور مغربی ممالک کو اس کے اندر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تو انہوں نے نفسیاتی جنگ شروع کی اور مسلمانوں کے اندر متحرک گروہوں کو طرح طرح کے نام دیئے اور اسلامی قوانین کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ شریعت کو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ اور انسانی حقوق پر شبخون قرار دینے لگے۔ ہم آئے دن اخباروں میں ان کے بیانات پڑھتے ہیں جن میں وہ مسلمانوں کو بنیاد پرستی (Fundamentalism) کا طعنہ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ پروپیگنڈہ نہایت زہر آلودہ ہے جس سے خود ہمارے عوام و خواص متاثر

ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ارباب اختیار بھی غیر مسلموں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے حدود اللہ کو انسانی احترام کے منافی قرار دیتے اور ان کی راہ روکنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ برملا بنیاد پرستوں کے اسلام سے اظہار براءت کرتے اور اس اسلام کا دم بھرتے ہیں جس کا تعلق عیسائیوں کے مذہب کی طرح دنیوی معاملات سے نہ ہو اور جو اپنے آپ کو محض انفرادی زندگیوں اور ذاتی پسند و ناپسند تک محدود رکھے۔ اس طرح کے بیانات ہماری وزیر اعظم صاحبہ اور ان کی کابینہ کے ارکان کی زبان سے حال ہی میں جاری ہوئے ہیں۔

ارباب اختیار کے اس طرح کے بیانات سے یہ بات تو اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ وہ غیر مسلم طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور انہی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی باعمل مسلمان شریعت کے قوانین کے بارے میں کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لا سکتا جو اس کی تنقیص کا باعث ہو اور نہ نفاذِ اسلام کو وہ کوئی دقیانوسی حرکت قرار دے سکتا ہے۔ اس کی تمنا تو یہی ہو گی کہ وہ اسلام کے اجتماعی نظام کی برکات سے متمتع ہو اور ربِ کریم کی عبودیت میں زندہ رہ کر اور اسی میں موت سے ہمکنار ہو کر ابدی سرخروئی حاصل کرے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طرزِ زندگی اپنانا اور خدا کا باغی ہو کر مرنا صرف لاخیروں کا مطمع نظر ہو سکتا ہے۔

مغربی دنیا جہاں متعصب ہے وہیں تحقیق پسند بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرنے والے اور پروپیگنڈا مہم چلانے والے برسرِ عمل ہیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے محققین بھی یہ جاننے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ آخر وہ کیا سبب ہے کہ مسلم امۃ اتنے زخم کھا کر بھی شکست خوردہ نہیں ہوتی اور اس کی چنگاریوں میں شعلہ بننے کی صلاحیت ابھی تک موجود ہے۔ مسلمانوں کی بیداری کے اسباب پر مغربی مصنفین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں ان مصنفین کی آراء کا جائزہ لینا مفید ہو گا تاکہ ہمارے ارباب اختیار کو بھی معلوم ہو کہ وہ جس بنیاد پرستی کی مذمت کر رہے ہیں وہ مغرب کے محققین کی نگاہ میں کیا معنی رکھتی ہے۔

جینسن (JANSON) نے متحارب اسلام (MILITANT ISLAM) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس دور میں جوشِ عمل اور تحریک صرف مسلمانوں ہی میں نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں مثلاً ہندوؤں اور بدھوں میں بھی ہے۔ یہ مشرقی ممالک کی ایک مشترکہ خصوصیت ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی یلغار کے آگے

بند باندھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی مذہبی اقدار کو تباہ ہونے سے بچا سکیں۔ جہاں تک مسلمان معاشرہ کا تعلق ہے یہ تیرھویں صدی کے بعد سے منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس پر جمود طاری ہے جس کے باعث یہ جدید دُنیا کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لہٰذا مسلمانوں میں اپنی مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے تحریکیں اُٹھ رہی ہیں۔

عمانویل سائیون (EMMANUEL SIVAN) کی کتاب "اساسی اسلام" (RADICAL ISLAM) میں بھی مذکورہ نقطۂ نظر کی تائید کی گئی ہے۔ مصنف نے مصر، شام، اور لبنان کے سنی بنیاد پرستوں کے مقاصد کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تحقیق کی رُو سے احیائے اسلام کی کوششوں میں اگرچہ جوشِ عمل اور جنگجویانہ مزاج پایا جاتا ہے لیکن اصلاً یہ ایک ثقافتی عمل ہے جس میں تیز سیاسی کاٹ بھی آگئی ہے۔ اس کا مقصد دفاعی ہے تاکہ مسلمان قوم کو جدید تہذیب کی یلغار کے اثرات سے محفوظ کیا جا سکے۔

اسی سے ملتے جلتے نتائج تک پیٹرک بینرمین (PATRICK BANNERMAN) اپنی تصنیف "اسلام اپنے تناظر میں" (ISLAM IN PERSPECTIVE) میں پہنچا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر اپنی سمت اور اپنی منزل واضح نہیں ہے۔ لیکن اپنے بارے میں جو تشویش ان کو لاحق ہے اس کا اظہار مذہبی تنظیموں کی کثرت اور غیر اسلامی قوانین کے خلاف مطالبات کے ذریعے ہو رہا ہے۔ مصنف کا خیال یہ ہے کہ احیائے اسلام کا خواب اب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ ان کو اربابِ اقتدار کی طرف سے نفاذِ اسلام میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ معاشرہ میں دین اور اقتدار عملاً الگ الگ ہو چکے ہیں۔ اب ان میں اس ہم آہنگی کے واپس آنے کے امکانات نہیں ہیں۔ جو خلفائے راشدین کی حکومت کا خاصہ تھی۔ مصنف کا تجزیہ یہ بھی ہے کہ عالمی سطح پر احیائے اسلام کی کوششوں میں باہم تعاون اور یک جہتی نہیں ہے۔

"اسلام کی حیاتِ نو کے چرچے" (VOICES OF RESURGENT ISLAM) کے مصنف جان اسپوسیٹو (JOHN ESPOSITO) کا خیال یہ ہے کہ یورپ کے نو آبادیاتی اقدامات نے اسلامی دُنیا کو فوجی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے مغربی عیسائی دُنیا کے آگے بے بس کر دیا اور اس کی وحدت کو اس طرح پارہ پارہ کر دیا کہ اس کی پہچان مشکل ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کو ایک سیاسی مقصد فراہم کیا۔ چنانچہ

بیسویں صدی میں مصر، تیونس، الجزائر اور ہندوستان میں ایسی قومی تحریکیں چلیں جن کا ہدف نو آبادیاتی نظام تھا۔ ان تحریکوں کے باعث مسلمانوں کی سیاست میں مذہب کو عمل دخل کا موقع مل گیا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد جو ریاستیں وجود میں آئیں انہوں نے مغربی نمونوں کی تقلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام پھر سے سیاسی منظر سے ہٹ گیا۔ اس وقت احیائے اسلام کی تحریکوں کے اسباب میں اپنی ملی شناخت کا مسئلہ، مغربی ممالک سے بدظنی، اپنی حکومتوں کی ناقص کارکردگی اور دین سے انحراف اور ۱۹۷۳ء میں فوجی اور معاشی میدانوں میں چند کامیابیوں پر احساسِ فخر شامل ہیں۔ کامیابیوں سے اشارہ مصر کی اسرائیل کے ساتھ جنگ اور عربوں کے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی طرف ہے۔

ڈیکمیجین (DEKMEJIAN) نے عرب دُنیا میں بنیاد پرستی کا مطالعہ اپنی کتاب "انقلابِ اسلامی" (ISLAMIC REVOLUTION) میں پیش کیا ہے۔ اس نے ۹۲ مسلم سوسائٹیوں کے جائزہ کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی بنیادوں کی طرف لوٹنے کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ یہ تحریک ہمہ پہلو ہے جس کا اظہار بیک وقت روحانی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی دائروں میں ہو رہا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ اسلام میں ایک داخلی سماجی و سیاسی نظام ایسا موجود ہے جو ملّت کی اندرونی کمزوریوں اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں تجدید پر ابھارتا ہے۔ اس احیائی ردِ عمل کے طور پر ملّت اصل بنیادوں کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام میں عمل نمونہ کے لیے معیار قرآن مجید کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی طریقہ ہے۔ ان سے انحراف کو جاہلیت کی طرف لوٹنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

جان وال (JOHN VOLL) اپنی کتاب "اسلامی تاریخ میں تجدید و اصلاح" (RENEWAL AND REFORM IN ISLAMIC HISTORY) میں اسلامی دُنیا کے اندر ایک متحرک پہلو کی نشاندہی کرنے کے لیے اسلام کی تجدید و اصلاح کی روایت کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی مسلمانوں کے سامنے نمونہ قرآن مجید اور رسول اللہؐ کی سنت ہے۔ اس سے انحراف ہو تو امت کو تحریک ملتی ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی جدوجہد کرے۔

یہ ہے ان اہم کتابوں کی تحقیق کا خلاصہ جو ادھر چند سالوں میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں جو مضمون مشترک ہے وہ یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ مغربی تہذیب کے آگے سرنگوں ہونے کے

لیے تیار نہیں ۔ وہ اپنی دینی اقدار کا تحفظ چاہتی ہے ۔ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے حکمرانوں سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ دین کے اجتماعی نظام کو نافذ کریں تاکہ وہ اسلام کی برکات سے پوری طرح متمتع ہو سکے ۔ حکمران جب اس توقع پر پورا نہیں اترتے اور اقتدار کے زعم میں دین کے تقاضوں سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی رعایا جنگ جویانہ رویہ اختیار کر لیتی ہے جس کے مظاہرے آئے دن اسلامی ممالک میں ہو رہے ہیں ۔ مغربی محققین میں سے بعض دانشور اس حقیقت کو بھی پا گئے ہیں کہ مسلم امت میں یہ شعور یونہی نہیں پیدا ہو گیا ہے بلکہ خود اسلامی تعلیمات کے اندر کوئی ایسی بات موجود ہے کہ وہ لوگوں کو یہ فرض ادا کرنے پر ابھارتی ہے ۔

بان وال نے تو اس جذبہ کو تجدید و اصلاح کے اسلامی ناموں سے تعبیر بھی کیا ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچ بھی گیا ہے کہ امت مسلمہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کے علمی معیار کو سامنے رکھتی ہے اور اس سے انحراف برداشت نہیں کرتی ۔ کاش ہمارے حکمرانوں کو بھی ان حقائق کے سمجھنے کی توفیق ہو اور وہ صدق دل سے امت مسلمہ کی دینی امنگوں کو پورا کرنے کی جدوجہد کریں اور اقتدار کے نشہ میں اپنے قول و عمل سے کوئی ایسی بات نہ پیدا کریں جو بعد میں خود ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے ۔

اعلان

مولانا امین احسن اصلاحی کے دروس قرآن و حدیث اب حسب ذیل پتہ پر منتقل کر دیے گئے ہیں :

۹ - وی سیکٹر فیز II ڈیفنس سوسائٹی - لاہور ۔

اوقات درس یہ ہیں :

درس قرآن : جمعہ ۹ بجے صبح

درس حدیث (صحیح بخاری) : پیر بعد از نماز مغرب

—— ادارہ ——

تدبر قرآن

خالد مسعود

تفسیر سورۃ انعام (۳)

ان سے پوچھو ، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جب کہ اسی کو تم پکارتے ہو ، گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے ؟ ۞ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو[۴۴] ۞ کہہ دو وہ خدا قادر ہے اس بات پر کہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھا دے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس میں گتھم گتھا کر دے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا اچھی طرح چکھا دے ۔ دیکھو کس کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے[۴۵] بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں ۞ ۶۵

---

۴۴ یہاں دو باتیں نگاہ میں رکھنے کی ہیں ۔ ایک یہ کہ جب انسان کسی مصیبت میں پھنستا ہے تو وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا اعتماد جاگزیں ہے ۔ دوسری یہ کہ یہاں شکر اور شرک کو دو مقابل چیزوں کی حیثیت سے دکھایا ہے ۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی بتوں کو پوجے ، بلکہ وہ اکبا بھی شرک ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان من مانی کرنے لگ جاتا ہے یہ حالت شکر کی ضد ہے ۔

۴۵ یعنی یہ نہ سمجھو کہ آج اگر امن و اطمینان کی زندگی حاصل ہے تو پھر کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتے ۔ خدا جب چاہے تمہارے اوپر پتھر برسا دے ، گرد و باد بھیج دے ۔ اسی طرح جب چاہے عین تمہارے پاؤں کے نیچے سے زلزلہ ، سیلاب یا کوئی اور آفت ارضی بھیج دے ۔ یہ نہیں تو تمہیں آپس ہی میں قبیلہ قبیلہ گروہ گروہ اور قوم قوم کو باہم ٹکرا دے اور ایک دوسرے کے ظلم و تشدد

اور تمہاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو میں تمہارے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں ۝ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے ۝ ۶۷

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو ۝ جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں ۝ ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے۔ اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اس کے ذریعہ سے یاد دہانی کرو کہ نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی کارساز ہوگا نہ سفارشی۔ اور اگر وہ ہر معاوضہ بھی دے تو بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور ایک دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی پاداش میں ۝ ۷۰

کہہ دو کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع پہنچا تی ہیں نہ نقصان اور ہم پیٹھ پیچھے پھینک دیے جائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہے، اس شخص کے مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو، اس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آجا۔ کہہ دو اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب

کا مزا چکھا دے۔ ان میں سے ہر بات ہر وقت خدا کی قدرت میں ہے۔

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ یہ رویہ اس حکمتِ دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ لہٰذا جب دیکھو کہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ۔ دوسرا یہ کہ یہ اس غیرتِ حق کے منافی ہے جو اہلِ ایمان کے اندر ہونی چاہیے۔ یہ غیرت علامت ایمان ہے اور اس کا ضعف درجہ بدرجہ آدمی کو نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں نہ زیادہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے نت نئے مطالبات کے لیے فکرمند ہونے کی۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے اپنا فرض تذکیر و تبلیغ جو تم پر عائد ہوتا ہے ادا کرتے رہو تاکہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔

یہ مخالفین کی ایمانی و اخلاقی گم گشتگی کی تمثیل ہے۔ اس میں ان کے سامنے یہ بات رکھی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکے ہوئے مسافر کی

کے حوالے کریں ۝ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے ۝ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ غایت کے ساتھ۔ جس دن کہے گا ہو جا تو ہو جائے گا۔ اس کی بات شدنی ہے۔ اور اسی کی بادشاہی ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے ۝ ۷۳

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں ۝ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے ۝ ۷۵

پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا۔ بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۝ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا بولا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی

مانند ہو، شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے تمہاری مت ماردی ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (یعنی اہل ایمان) تمھیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن تم ان کی پکار نہیں سن رہے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد شرک کی اس وادی گم گشتگی میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے اسی کی نماز پڑھنے اور اسی سے ڈرتے رہنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ہے۔ اب اس معاملے میں کسی بحث و جدال کی گنجائش نہیں ہے۔

یہ کارخانۂ کائنات کے بامقصد ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت لازماً آئے گی۔ اس دن حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا سب پر واضح ہو جائے گا۔

حضرت ابراہیم کو بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی اپنا خاندانی جد اعلیٰ اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور مدعی تھے کہ جس دین پر وہ ہیں وہ ان کو انھی سے وراثت میں ملا ہے۔ مشرکین تمام مشرکانہ بدعات میں انھی کے نام نامی کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ یہاں بنی اسماعیل پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ان کے دینِ شرک کو حضرت ابراہیمؑ سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں اور اسلام کی دعوت تمام سابق انبیاء ہی کی دعوت ہے۔

ملکوت سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ تکوینی بادشاہی ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس ملکوت پر غور کرنے سے وہ علم ہاتھ آتی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس مشاہدہ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انھوں نے اپنی قوم پر قائم کی۔

تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا ۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے ۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ۔ میں نے تو اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں[۹۳] ۔ ۷۹

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی ۔ اس نے جواب دیا کہ تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؛ در آں حالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی ہے ۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے ۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے ۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے ۔ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل[۹۴] نہیں اتاری ۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے ۔ اگر تم جانتے ہو ۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن اور چین ہے ۔ اور وہی راہ یاب ہیں[۹۵] ۔ ۸۲

یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی ۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں ۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے ۔ اور ہم نے اس کو اسحاق اور

---

[۹۳] حضرت ابراہیم کی قوم بڑی مناظرہ باز اور حجت طراز تھی ۔ ان کے مزاج کی اس واقفیت کی وجہ سے آپ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے یعنی وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے ہیں جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہو کہ وہ گھیرے میں آ سکتا ہے ۔ یہ واقعہ بھی اسی طریقہ تبلیغ کی مثال ہے ۔ اس میں انہوں نے اپنی قوم کو اجرام فلکی کی محکومی کی طرف توجہ دلا کر بتایا ہے کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے ۔ ہدایت کا سرچشمہ صرف خداوند تعالیٰ ہے ۔ لہٰذا میں نے تمام معبودان باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ رب کی طرف کر لیا ہے ۔

[۹۴] شرک کی بنیاد خوف و وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے ۔ اس لیے حضرت ابراہیم کے اعلان توحید پر لوگوں نے ان کو اپنے فرضی معبودوں کی پکڑ سے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا لیکن انہوں نے قوم پر واضح کیا کہ جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے ۔ البتہ تمھیں خدا کے غضب اور قہر سے ڈرنا چاہیے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمہارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے ۔

[۹۵] یہ توحید کے بارے میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں ۔ امن کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد کرتے ہیں اور شرک سے بری ہیں ۔

یعقوب عطا کیے ۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے، اور اس کی ذریت میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی ۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں ۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے ۔ اور اسمٰعیل، یسع، یونس اور لوط کو بھی ۔ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے عالم والوں پر فضیلت بخشی ۔ اور ان کے آباؤ اجداد، اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے ۔ اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے[۹۶] رہ جاتا ۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور قوت فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی ۔ تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں ۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو ۔ اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے ۔ ۹۰

اور انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری[۹۷] ۔

---

[۹۶] اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیم کا فکری ارتقا سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے خلاف ہے ۔ اگر یہ تو ان کا ومرت کا ارتقا ہے ۔ حضرات انبیاء علیہم السلام فطرت سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرت سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں ۔ توحید و شرک کے معاملے میں ان کو کبھی اشتباہ پیش نہیں آتا ۔ دعوت میں استدراج کا طریقہ دوسرے طریقوں کی طرح انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہے اور یہ کئی حجتوں پر بھاری ہے ۔

[۹۷] یعنی اللہ نے حضرت ابراہیم کو اور ان کی دعوت کو رشد و ذکر و شہرت دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی ۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء و رجلِ مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے ۔ ان کا دین توحید تمام انبیاء کا مشترک دین ہے ۔ اللہ کے ہاں بڑے مرتبے پانے والے صالحین بھی اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا ہیچ ہو کے رہ جاتا ۔

[۹۸] مراد یہ ہے کہ کتاب، حکمت اور نبوت کی نعمتوں سے ہم نے تمہارے واسطے اس گھر کو نوازنا چاہا ہے اگر یہ لوگ ان نعمتوں کی ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو ۔ اللہ نے جن بندوں کو اس کے حق میں کھڑا کر دیا ہے وہ اس دعوت کے علمبردار رہیں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے ۔

[۹۹] یہ بات کہنے والے یہود تھے جو اصل میں تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے ۔ لیکن یہ بات زبان پر لا کر وہ عربوں کی حمیت کو بھڑکانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے ۔ لہٰذا انہوں نے دوسرے کم کو شہ دینے کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ کوئی شخص بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے وہ سر بسر غلط ہے ۔

ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری تھی جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا[۵۰]۔ کہو وہ اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں ۞ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری، بابرکت، تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیزوں کو، اور تاکہ تو خوش خبری دے، اور تاکہ تو ہوشیار کر دے ام القریٰ[۵۱] اور اس کے اردگرد والوں کو، اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ۞ ۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو، اور اس سے جو دعویٰ کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا[۵۲]۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالے کرو، آج تم ذلت کا عذاب[۵۳] دیے جاؤ گے، بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے، اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض[۵۴] کرتے تھے ۞ اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب

---

[۵۰] یعنی جب تم نے تورات کے ساتھ یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑ دیتا اور وہ روشنی و ہدایت کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

[۵۱] ام القریٰ سے مراد مکہ ہے جو بنی اسماعیل کی مرکزی آبادی تھی، یہی ان کا دینی و سیاسی مرکز اور ان کے اعیان و اکابر کا مستقر تھا۔ فرمایا کہ ان کو قرآن جیسی بابرکت کتاب دی گئی ہے جس کی بشارت سابق انبیاء نے دی تھی اور جس کا ذکر پچھلے صحیفوں میں موجود ہے۔

[۵۲] اس آیت میں مخاطب مشرکین مکہ کے لیڈر ہیں، ان کی باتیں کبر و غرور پر مبنی تھیں اس لیے باتوں کا جواب دینے کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی ہے۔ وہ کہتے کہ جس وحی کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے، اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی دعوتوں سے وہ عوام پر اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔

[۵۳] ذلت کا عذاب اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابلے میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔

[۵۴] سب سے زیادہ ہلاک کرنے والی چیز جھوٹی غرور اور عزت کے سبب سے ہو۔ یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش مکہ کے لیڈروں کو یہ بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اس غرور کے انجام بد کی ہولناکی ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے گی۔

تم نے پیچھے چھوڑا، اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمہارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے سب ہوا ہو گئیں ۞ ۹۴

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے[۵۵]۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ[۵۶] سے۔ پس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو ۞ وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے ۞ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں ۞ اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے، پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن[۵۷] ہے۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں[۵۸] ۞ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہم ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں ۞ ۹۹

---

[۵۵] اوپر کی آیات میں توحید کا مضمون آیا تو اس کی وضاحت کے لیے توحید کے آفاقی دلائل آگے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے صحیح نقطہ نظر کی طرف بھی رہنمائی ہو جائے۔

[۵۶] یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے ابھرنے اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے، جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشہ میں برابر کر رہے ہیں۔ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔

[۵۷] خارجی عالم کی نشانیوں کے بعد اب یہ انسان کی خلقت اور اس کے اردگرد جو سامان معاش و معیشت فراہم فرمایا گیا ہے اس کی طرف توجہ دلائی۔ انسان کا ایک وقت خاص تک دنیا میں رہنا سہنا اور کھانا پینا اور مرنے کے بعد زمین کی تحویل میں دے دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔

[۵۸] ان نشانیوں سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا کا کارخانہ متضاد قوتوں کی رزم گاہ نہیں، یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشا، کسی کباڑیے کی دکان اور بے مقصد کارگاہ بھی نہیں بلکہ اس کے ہر گوشے سے صانع کی قدرت، حکمت، علم اور رحمت کی شہادت مل رہی ہے۔

تدبرِ قرآن

خالد مسعود

اسالیبِ قرآن

قرآن مجید کے متعلق جو بات بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے اور عربی زبان بھی عام طور پر اہلِ عرب کی نہیں بلکہ خاص اس قبیلہ قریش کی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور یہ اس زمانہ کی عربی ہے جس زمانہ میں قرآن کا نزول ہُوا۔ اس حقیقت کو خود قرآن مجید نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۔ (ابراہیم-۴)	اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان پر اچھی طرح واضح کر دے۔
فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (الدخان-۵۸)	پس ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں نہایت خوبی سے آراستہ کیا تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔

لہٰذا قرآن مجید کے کسی بھی طالب علم کے لیے یہ بات ضروری قرار پاتی ہے کہ وہ اس سے استفادہ کے لیے چودہ سو سال قبل کی وہ عربی سیکھے جو قریش کے ہاں مستند سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں لے جائے۔ الفاظ کے معانی ہوں یا جملوں کا دروبست، ان کا فہم وہ اس ماحول سے حاصل کرے۔ اس بارے میں بعد کے ادوار کی وہ عربی مستند نہیں سمجھی جا سکتی جس میں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بیان و اسلوب کی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ابھی تک ہو رہی ہیں جب کہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں باقی ہے جس پر وہ نازل ہوا تھا اور جب تک دنیا قائم ہے اسے اسی شکل میں باقی رہنا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے پہلے الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے لہٰذا ایک طالب علم کی جستجو یہ ہوتی ہے کہ زیرِ غور لفظ کے معنی کیا ہیں۔ یہ فعل ہے، اسم ہے یا حرف؟ اس کی اصل کیا ہے اور اس اصل سے یہ کس طرح تبدیل ہو کر بنا ہے۔ اس تبدیلی سے معنی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ مشتق ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کیا معنی بیان کرتے ہیں، قدیم عرب ادیبوں اور شعراء نے اس سے کس مفہوم کو ادا کرنے میں مدد لی ہے اور خود قرآن مجید نے مختلف مقامات پر اسے کن کن مفاہیم میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ایک طالب علم اپنی اس تحقیق کے لیے کلامِ عرب کا مطالعہ کرتا ہے، عربی لغات کی طرف رجوع کرتا ہے اور قرآن مجید کے نظائر کو جمع کرتا ہے۔ اس سے اس کو فی الجملہ لفظ کی اصل اور اس کے معانی کو سمجھنے کی راہ ملتی ہے۔

لفظ کی تحقیق کے بعد اس جملے کو سمجھنے کا مرحلہ آتا ہے جس میں وہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جملے میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس میں پائے جانے والے الفاظ کا اعراب کیا ہے۔ کلام کی ترکیب کیا ہے۔ جملے کے دروبست میں الفاظ کیا مفہوم دے رہے ہیں۔ اس تحقیق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متعلم عربی زبان کی گرامر سے واقف ہو۔ صرف و نحو سیکھنے میں اس کو اتنی مہارت ہو چکی ہو کہ وہ جملے کی ساخت کو سمجھ لیتا ہو۔ اور ترکیبِ کلام کے معانی تک اس کو رسائی حاصل ہو جاتی ہو۔

زبانوں کے سیکھنے میں عام طور پر الفاظ کے معانی اور جملوں کی ساخت سے واقف ہونا کافی ہوتا ہے لیکن معیاری ادب میں بعض اسالیب ایسے پائے جاتے ہیں جو محض گرامر کی گرفت میں نہیں آتے اور ان کے بغیر کلام کا زور سمجھ میں نہیں آتا۔ قرآن مجید بالاتفاق عربی زبان کی سب سے زیادہ فصیح و بلیغ کتاب ہے۔ اس کی زبان کا معیار اتنا بلند ہے کہ آج تک کوئی شخص اس جیسا ادب پیدا نہیں کر سکا۔ قرآن مجید نے نزولِ قرآن کے زمانے کے اپنے مخالفین کو یہ چیلنج کیا تھا کہ اس کے ٹکر کا کلام پیش کریں۔ لیکن وہ باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکے۔ یہ چیلنج آج بھی ہر اس شخص کے سامنے ہے جو قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شک رکھتا ہو، وہ بھی اس معاملے میں اسی طرح ناکام ہے جس طرح چودہ سو سال پہلے کا انسان تھا۔ لہٰذا قرآن مجید کی زبان کو بالکل

سپاٹ سمجھ لینا محض نادانی ہے۔ اس کتاب میں جہاں ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی آباد ہے وہیں اس کے اسالیبِ کلام میں بڑا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر ان اسالیب سے واقف نہ ہو تو وہ الفاظ اور جملوں پر سے سرسری طور پر گزر ہ ، رسائی ان معانی تک نہیں ہو سکتی جو فی الواقع ان جملوں کے ہوتے ہیں یا ایک جملہ حسرت کے ساتھ ادا کیا جائے یا اس کا سبب متکلم کا غیظ و غضب بن ہو یا اس میں خوشی کا اظہار ہو تو اگر قاری معمولی گرامر کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو تو وہ اس کے موقع و محل سے بالکل واقف نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح بڑا فرق واقع ہو جائے گا۔ اگر ایک قاری یہ بات نہ سمجھ پائے کہ ایک خطاب کس شخصیت یا کس گروہ سے ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک ایسی بات کا مخاطب جو کفار سے کہی گئی ہو، مسلمانوں کو سمجھ لے اور اس طرح قرآن مجید کے مدعا کو بالکل الٹ کر رکھ دے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کا ہر طالب علم اس کے اسالیب کا فہم حاصل کرے اور ان میں اس قدر مہارت حاصل کر لے کہ وہ بہ آسانی کلام کے مدعا کو سمجھتا جائے۔

مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے فہم قرآن کی راہ ہموار کرنے کے لیے جس طرح اصول تاویل قرآن پر رسالے لکھے اسی طرح بعض اہم الفاظ کی شرح میں مفردات القرآن، گرامر میں اسباق النحو اور اسالیب کے لیے اسالیب القرآن جیسی کتب تصانیف کیں۔ موخرالذکر کتاب دائرہ حمیدیہ سرائے میر (اعظم گڑھ) نے ۱۳۸۹ھ میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں مولانا فراہی نے ۳۲ عنوانات قائم کرکے قرآن مجید کے اسالیب کو واضح فرمایا ہے۔ ہر اسلوب کی مثالیں بھی فراہم کی ہیں لیکن یہ کتاب مولانا کی بعض دوسری تصانیف کی طرح مرتب کتاب نہیں ہے بلکہ اشارات ہیں جن پر غور کرکے ایک شخص اپنے لیے فہم قرآن کی راہ نکال سکتا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مولانا کے فکر کو مرتب کیا جائے اور ہر اسلوب کے مزید نظائر فراہم کرکے کتاب کو آسان اور قابل فہم بنایا جائے۔ مولانا کی اصل کتاب عربی میں ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم اس کے مباحث کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہمارے اردو داں قارئین بھی مولانا کی تحقیق سے فائدہ اٹھا سکیں۔

قران :

قران سے مراد دو کلمات یا دو جملوں کا ساتھ ساتھ آنا ہے، خواہ ان کے درمیان کوئی حرفِ عطف آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ مثال کے طور پر آیت بسم اللہ میں صفات الرحمٰن اور الرحیم ایک ساتھ آئی ہیں۔ یہ دونوں کلمات ایک دوسرے کے قرین کہلائیں گے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (۲ : ۱۹۶) میں الحج اور العمرۃ کے کلمات قرین ہیں لیکن ان کے درمیان حرفِ عطف آیا ہے جب کہ الرحمٰن اور الرحیم حرفِ عطف کے بغیر ہیں۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵ : ۹۸) میں دو جملے قرین ہیں۔ پہلے ہم اس قران کو زیر بحث لائیں گے جو حرفِ عطف کے بغیر ہو۔

قران بلا حرفِ عطف :

حرفِ عطف کے بغیر قران کا اسلوب اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ تمام قرینوں کا حکم بیک وقت پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ میں صفات رب العالمین، الرحمٰن الرحیم، مالک یوم الدین قرین ہیں اور بغیر عطف کے ہیں لہٰذا یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایسی صفات ہیں جو اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ جہانوں کا رب بھی ہے، رحمان رحیم بھی ہے اور وہی روزِ جزا کا مالک بھی ہے۔

سورہ النحل میں ہے : اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا۔ اس میں امۃ، قانتا للہ اور حنیفاً کے کلمات قرین بلا حرفِ عطف ہیں۔ لہٰذا مراد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ذات میں ایک امت تھے۔ وہ اللہ کے فرمانبردار اور اس کی عبادت میں یکسو تھے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۸ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ میں ان لوگوں کی تمثیل دی ہے جو بیک وقت بہرے بھی ہیں، گونگے بھی اور اندھے بھی۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی خیر خواہ کی پکار سن کر یا اس سے بات کرکے یا اس کی دکھائی ہوئی علامت دیکھ کر اپنی غلطی پر متوجہ ہوں اور سیدھی راہ پر آجائیں۔

سورۂ فتح کی آیت ۲۹۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مفہوم یہ ہوگا کہ رسول اللہ کے صحابہ کرام کفار کے لیے تو نہایت سخت جان لیکن آپس میں نہایت

نرم خو ہیں ۔ یہ دونوں صفتیں ان میں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات عام طور پر قرآن کے اسلوب میں آتی ہیں ۔ ان کے بارے میں یہ بات تو اوپر کی بحث سے معلوم ہو گئی کہ یہ صفات اس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں ۔ مزید غور کرنے سے اس قرآن کے بعض اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں مثلاً :

یہ صفات محض برائے بیت نہیں آتی ہیں بلکہ ان کا تعلق سابق مضمون کے ساتھ ہوتا ہے ۔ یہ اس مضمون کے اثبات کے لیے دلیل کے طور پر یا اس سے پیدا ہونے والے اشکال کو رفع کرنے کے لیے آتی ہیں کہیں یہ زائد از ضرورت نہیں ہیں ۔ حتیٰ کہ الرحمٰن اور الرحیم اگرچہ ایک ہی مادہ رحم سے ہیں لیکن ان کے وزن فعلان اور فعیل کے اختلاف نے ان کے معانی میں فرق پیدا کر دیا ہے ۔ فعلان کا وزن شدت ، وفور اور جوش پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کے وزن سے تسلسل اور استقلال کا مفہوم ادا ہوتا ہے ۔ گویا الرحمٰن الرحیم کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کی ذات میں صفتِ رحمت کا وفور اور جوش بھی ہے اور اس میں تسلسل بھی ہے ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی نہیں ہوتی ۔

بعض اوقات بنیادی صفت اگرچہ ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا ہے ۔ اس لیے قرآن میں اس کی یہ شکلیں نمایاں کر دی جاتی ہیں مثلاً عَفُوًّا غَفُوْرًا میں عفو و درگزر اور مغفرت ایک ہی صفت کے دو پرتو ہیں ۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ میں رافت و رحمت بھی ایک ہی صفت کے دو رُخ ہیں ۔ قرآن کے ذریعے یہ مختلف پرتو اور رُخ نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے ایک قاری سمجھ جاتا ہے کہ فلاں صفت کا بروز کن کن شکلوں میں ہوتا ہے ۔

بعض اوقات دو صفات قرآن کی صورت میں ایسی آ جاتی ہیں جو اگرچہ مختلف ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں کسی کُلّی معنیٰ میں وہ مشترک ہوتی ہیں مثلاً سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ میں سننے اور دیکھنے کی دو صفات کا تذکرہ ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سننا اور دیکھنا علم کے ذرائع میں سے ہیں گویا صفت علم کا حوالہ دو ذرائع علم سے دیا گیا ہے ۔ سورہ مومن میں صفات مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ اور سورہ نساء میں مُخْتَالًا فَخُوْرًا اسی قبیل سے ہیں ۔

کہیں کہیں قرآن کی صورت میں ایک صفت پہلی صفت کی ترجیح یا تاکید کے لیے آتی

ہے مثلاً : عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ میں صفت عزیز کے حوالہ سے تو یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اور ذوانتقام میں اسی صفت کا وہ خاص پہلو بیان کیا جس پر آیت کے سیاق و سباق میں زور دینا مقصود ہے ، یعنی یہ کہ وہ انتقام بھی لینا جانتا ہے ۔ مطلب یہ کہ لوگ کو آخرت میں اس ذات سے واسطہ پڑنے والا ہے جو اعمال کا بدلہ دے گی اور کوئی اس سے اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکے گا ۔ قرآن کی یہی شکل قَوِیٌّ عَزِیْزٌ اور قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ میں بھی ہے ۔

بعض جگہ قرآن میں دو متقابل صفات جمع کر دی جاتی ہیں تاکہ قاری ایک صفت پر قانع ہو کر یک رُخا رویہ نہ اپنا لے ۔ مثلاً اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ میں صفت احد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور سب سے الگ ہے ۔ اس کے ساتھ صفت صمد ملا دی جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ذات تمام مخلوق کے ساتھ اور سب کا سہارا بنی ہوئی ہے ۔ اس طرح صفات کا ایسا جامع تصور سامنے آگیا جس سے بندے غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے ۔ اسی طرح متقابل صفات هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ میں بیان ہوئی ہیں ۔ صفتِ رزاقیت بندوں پر انعام و اکرام کی طرف توجہ دلاتی ہے ، تو صفت ذوالقوۃ المتین سے خدا کی گرفت کے سخت ہونے کا مضمون ملتا ہے ۔ یہ دونوں مضامین مل کر بندے کا رویہ درست رکھنے کا باعث بنتے ہیں ۔

کہیں دوسری صفت متقابل نہیں ہوتی لیکن پہلی صفت کے بارے میں پیدا ہونے والی کسی غلط فہمی کو رفع کرتی ہے مثلاً عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ میں صفت حکیم اس شبہ کو زائل کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہونے کے سبب سے ہمیشہ معاملہ سخت گیری کا کرتا ہوگا ۔ صفت حکیم کے حوالے سے یہ واضح کر دیا کہ اس کا ہر پہلو حکمت پر مبنی ہوتا ہے ۔ سخت گیری وہ اس جگہ کرتا ہے جہاں اس کا قانون اس کا تقاضا کرتا ہے یہی مفہوم غَنِیٌّ حَمِیْدٌ کے قرآن میں ہے ۔ اللہ تعالیٰ غنی یعنی سب سے بے نیاز و بے پروا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے مخلوق کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ وہ حمید یعنی سزاوارِ حمد کاموں کا منبع بھی ہے اس لیے خلق پر اس کا فیض برابر جاری رہتا ہے ۔

جب ایک صفت کے ساتھ متعدد مختلف صفات کا قرآن ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوتا

باقی ص ۴۸ پر

امین احسن اصلاحی

زکوٰۃ (۲)

مؤطا امام مالک کی کتاب الزکوٰۃ کی روایات

۸۔ حدثنی یحییٰ عن مالك عن ربیعَةَ بن أبي عَبْدِ الرَّحْمٰن عَنْ غَيْرِ واحدٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطَعَ لِبِلَالِ بْنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِيِّ مَعَادِنَ الْقَبَلِيَّةِ وَهِيَ مِنْ نَاحِيَةِ الْفُرْعِ فَتِلْكَ الْمَعَادِنُ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا إِلَى الْيَوْمِ إِلَّا الزَّكوٰةُ۔

□ ... ابو عبد الرحمٰن ایک سے زائد راویوں سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مزنی کو قبلیۃ میں، جو فُرع کے جوار میں ہے، اس کی معدن جاگیر میں دے دی۔ ان معادن میں سے آج تک زکوٰۃ کے سوا کوئی چیز نہیں لی گئی۔

اکثر فقہا کے نزدیک معادن میں صرف سونے اور چاندی کی کانیں شمار ہوں گی۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ نقدین کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں مثلاً لوہا، کوئلہ، تانبا، گیس، تیل، سنگِ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر اور اس زمانہ میں یورنیم اور دوسری معدنیات جو ایٹم بم بنانے کے کام آتی ہیں سب معادن میں شامل ہونی چاہئیں۔

امام مالکؒ کی رائے میں معادن میں سے کچھ نہیں لیا جائے گا جب تک کہ جو معادن میں سے نکلے وہ بیس دینار نقد یا دو سو درہم کے بقدر نہ ہوجائے۔ جب وہ اس مقدار کو پہنچ جائے تو اُس میں سے اُسی وقت زکوٰۃ کاٹ لی جائے گی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس میں یافت ہوتی رہے، جب یافت ختم ہوجائے تو زکوٰۃ کی کٹوتی بند کردی جائے گی۔ اگر دوبارہ

یافت شروع ہوجائے تو پھر نئے سرے سے اسی اصول پر زکوٰۃ کاٹی جائے گی۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ معدن بھی بمنزلہ زرعی زمین کے ہے جس طرح زمینی پیداوار پر فصل کٹتے ہی زکوٰۃ لی جاتی ہے۔ اسی طرح جب معدن سے کچھ نکلے گا تو اس میں سے زکوٰۃ لی جائے گی اور سال گذرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

حنفیہ کی رائے مالکیہ سے مختلف ہے۔ وہ معدن کو زرعی زمین کے بجائے دفینہ کے حُکم میں رکھتے ہیں اور جو یافت ہو اس میں سے پانچواں حصہ لیتے ہیں۔ وہ نہ تو نصاب کی شرط مانتے ہیں اور نہ سال گذرنے کی۔ میرے نزدیک دفینہ جنگ کے مالِ غنیمت کی طرح ایک اتفاقی دولت ہے۔ اس کے برعکس معدن کی تعمیر پر سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ معدنیات نکالنے کے لیے مزدوروں اور کاریگروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح خاصی مشقت اور سرمائے کے مصرف کے بعد یافت ہوتی ہے۔ شریعت کے اصول سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن چیزوں کے حاصل کرنے پر بڑی لاگت آتی ہے تو اس میں زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی ہے اور جس میں لاگت نہ آتی ہو تو اس میں زکوٰۃ کی شرح زیادہ ہے لہٰذا اس مسئلہ میں حنفیہ کی رائے مجھے صائب نہیں معلوم ہوتی۔

۹۔ حدثنی یحییٰ عَنْ مَالِكٍ عن ابْنِ شِهَابٍ عن سعید بن الْمُسَيِّب وعن ابی سلمة بن عبد الرَّحْمٰن عن ابی هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ:

□ ... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دفینے میں پانچواں حصہ زکاۃ ہے۔

یہ روایت امام بخاریؒ نے باب الزکاۃ الرکاز الخمس میں لی ہے۔

اس روایت میں امام مالکؒ نے رکاز کی خود ہی تشریح کردی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بات میں اہلِ مدینہ میں کوئی اختلاف نہیں اور میں نے اہلِ علم سے سُنا ہے کہ دفینہ وہ ہے جو

جاہلیت کے دفینوں میں سے پایا جائے، جس کو پانے کے لیے نہ مال خرچ کرنا پڑے، نہ کوئی بڑی جدوجہد کرنی پڑے اور نہ کوئی ذمہ داری اٹھانی پڑے۔ رہی وہ چیز جس پر مال خرچ کرنا پڑے، بڑی محنت کرنی پڑے اور وہ کبھی مل جائے اور کبھی نہ ملے تو وہ رکاز نہیں۔

میرے نزدیک امام مالکؒ نے یہ فرق جو بیان کیا ہے درست ہے۔ مثال کے طور پر تیل کا کنواں کھودا جا رہا ہے۔ ممکن ہے تیل مل جائے لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ تیل نہ ملے تو یہ رکاز کے حکم میں نہ ہوگا بلکہ معادن میں شامل ہوگا۔ اس کے برعکس اگر دیوار کے لیے کھدائی کی جا رہی ہو اور زمین میں سے اشرفیوں کا صندوق نکل آئے جو بغیر اہتمام کے مل جائے تو یہ دفینہ کے حکم میں ہوگا۔ اس میں سے پانچواں حصہ زکوٰۃ کی مد میں لے لیا جائے گا۔

۱۰۔ حدثنی یحیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ عبد الرَّحْمٰن بن القَاسِم عن اَبِیْهِ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَتْ تَلِیْ بَنَاتَ اَخِیْهَا یَتَامٰی فِیْ حِجْرِهَا لَهُنَّ الْحُلِیُّ فَلَا تُخْرِجُ مِنْ حُلِیِّهِنَّ الزَّکَاةَ۔

□ ... عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ اپنے بھائی کی لڑکیوں کی متولیہ تھیں۔ وہ لڑکیاں یتیم اور ان کے زیرِ تولیت تھیں، حضرت عائشہؓ ان کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں نکالتی تھیں۔

اس روایت کی رُو سے مالکیہ پہننے کے زیورات میں زکاۃ نہیں مانتے۔ لیکن حنفیہ پہننے یا نہ پہننے کے زیورات میں فرق کے قائل نہیں۔ حنفیہ کا اِستدلال یہ ہے کہ یتیموں کے مال میں سے متولی کو زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے، کیونکہ حضرت عائشہؓ خود یتیموں کے مال میں سے زکوٰۃ ادا کیا کرتی تھیں۔ ان کا انحصار ابوداؤد کی اس روایت پر ہے جس کی حضرت عائشہؓ خود ہی راوی ہیں کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی۔ اس نے اپنی بچی کو سونے کے کنگن پہنا رکھے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم اس کی زکوٰۃ دیتی ہو۔ اس نے کہا نہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا، کیا تم چاہتی ہو کہ قیامت کے دن تم کو آگ کے کنگن پہنائے جائیں۔ اس پر اس خاتون نے کنگن بچی کے ہاتھ سے اُتار کر پھینک دیے کہ یہ اللہ اور اس

کے رسولؐ کے لیے ہیں۔ اس روایت کی رُو سے حنفیہ زیورات پر زکوٰۃ واجب قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ قیاس کے خلاف ہے۔ استعمال کی جتنی چیزیں ہیں شریعت نے ان کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ سواری اور بار برداری کے گھوڑے، خچر، اونٹ۔ دُودھ کے لیے پالی ہوئی بکری اور گائے پر زکوٰۃ نہیں تو آخر سونے اور چاندی میں کیا ہے جب کہ یہ بطورِ زینت عورت کی ضروریات میں سے ہے۔ اسی بنا پر موتی، خوشبو اور عنبر وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں۔

مالکیہ استعمال کے زیورات کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح مذہب یہی ہے۔ زیور پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس کا مقصد دولت کو ذخیرہ کرنا ہو۔ عیدالفطر عید یا تقریبات پر پہننے کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں لی جائے گی۔

۱۱۔ حدثنی عن مالِکٍ عن نافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بنَ عُمَرَ کَانَ یُحَلِّیْ بَنَاتَهٗ وَجَوَارِیَهُ الذَّهَبَ ثُمَّ لَا یُخْرِجُ مِن حُلِیِّهِنَّ الزَّکَاةَ۔

□ ... حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونے کے زیورات پہناتے تھے لیکن ان کے زیورات سے زکوٰۃ نہیں نکالتے تھے۔

اس اثر سے بھی مالکیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور حنفیہ کا مسلک درست معلوم نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ کا فتویٰ ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ٹکڑا سونے یا چاندی کا ہو اور اس سے پہننے کا کام نہ لیا جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی، اِلّا آنکہ وہ نصاب سے کم ہو۔ امام مالک کے نزدیک اگر کوئی ٹوٹا ہوا زیور ایسا ہو جس کی مالک اصلاح کرانا چاہتا ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ بمنزلہ اس مال کے ہے، جس پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ اسی طرح امام مالک کہتے ہیں موتی، خوشبو اور عنبر میں بھی زکوٰۃ نہیں، کیونکہ یہ عورتوں کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ اس معاملہ میں امام مالک کا فتویٰ احناف کے خلاف ہے لیکن میرے نزدیک یہ صحیح ہے۔

۱۲۔ حدثنی یحیٰی عن مالکٍ اَنَّهٗ بَلَغَهٗ اَنَّ عُمَرَ بن الخَطَّاب

قَالَ اتَّجِرُوْا فِيْ اَمْوَالِ الْيَتَامٰى لَا تَاْكُلُهَا الزَّكَاةُ :

□ ... امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اعلان فرمایا کہ یتیموں کے مال میں تجارت کرو تاکہ زکوٰۃ ان کو ختم نہ کر دے ۔

یہ بات احناف کے مسلک کے خلاف ہے ۔ وہ یتیم اور صغیر کے مال میں تجارت روا نہیں رکھتے ۔ وہ زکوٰۃ کا مطلب مصرف لیتے ہیں جبکہ مصرف کے لیے زکوٰۃ کا لفظ درست نہیں ۔
میرے نزدیک یتامیٰ کے مال میں سے زکوٰۃ دینی چاہیے اور مال کو کاروبار میں لگا کر پروان چڑھانا چاہیے ۔ یتامیٰ کے باغ یا کھیتی میں سے بھی زکوٰۃ دی جائے گی ۔

۱۳ . حدثني عن مالك عن عبد الرحمٰن بن القاسم عن ابيه أَنَّهُ قَالَ كَانَتْ عَائِشَةُ تَلِيْنِيْ وَاَخًا لِيْ يَتِيْمَيْنِ فِيْ حَجْرِهَا . فَكَانَتْ تُخْرِجُ مِنْ اَمْوَالِنَا الزَّكَاةَ ۔

□ ... عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ میری اور میرے بھائی کی متولیہ تھیں اور ہم ان کی گود میں پل رہے تھے ۔ وہ ہمارے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرتی تھیں ۔

اِس اثر سے بھی اُوپر والی روایت کی تائید ہو جاتی ہے ۔

۱۴ . حدثني عن مالك اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ تُعْطِيْ اَمْوَالَ الْيَتَامٰى الَّذِيْنَ فِيْ حَجْرِهَا مَنْ يَتَّجِرُ لَهُمْ فِيْهَا ۔

□ ... امام مالک کو یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عائشہؓ ان یتیموں کا مال جو ان کی

تولیت میں تھے ایسے لوگوں کو دیتی تھیں جو ان کے لیے ان اموال میں تجارت کریں ۔

یہ بات قرآن سے بھی ثابت ہے اور عقلی طور پر بھی صحیح ہے ۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یتیم کا ولی ازروئے شریعت مجاز ہے کہ تجارت کرے اور وہ نقصان کا ذمہ دار نہ ہوگا ۔
ترکہ کی زکوٰۃ کے باب میں کوئی مرفوع حدیث یا اثرِ صحابہؓ نہیں ۔ صرف امام مالکؒ کے فتوے ہیں ۔
امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص کی موت واقع ہو جائے اور اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو زکوٰۃ اس کے ثلث مال میں سے لے لی جائے ۔ اس لیے کہ میت کے صرف ثلث مال میں ہی تصرف کیا جا سکتا ہے ۔ باقی مال وارثوں کا حق ہے ۔
میرے نزدیک میت کی دوسری وصیتیں اور قرض زکوٰۃ پر مقدم ہیں ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت اگر مرنے والے نے کی ہے تو وارثوں کو زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ۔ لیکن اگر میت نے وصیت نہیں کی تو یہ ورثاء کے اُوپر ہے ۔ اگر وہ زکوٰۃ ادا کریں تو بہتر ہے اور اگر وہ ادا نہ کریں تو ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں کی جا سکتی ۔ حکومت ان کی ملکیت وراثت میں تصرف نہیں کر سکتی ۔
امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ وارث کو جو مال ترکہ میں ملے تو اس پر زکوٰۃ اس وقت عائد ہوگی جب اس کی ملکیت پر ایک سال گزر جائے ۔ اگر ترکہ میں اُس کو زمین یا باغ یا فصل ملی ہے ۔ تب فصل کٹنے پر اس سے عُشر لیا جائے گا ۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ صحیح ہے ۔

۱۵ . حدثني يحيى عَنْ مَالِكٍ عَنْ ابن شهاب عن السَّائب بن يَزِيْدَ اَنَّ عُثْمَانَ بن عَفَّانَ كَانَ يَقُوْلُ ۔ هٰذَا شَهْرُ زَكَاتِكُمْ فَمَنْ كَانَ عَلَيْهِ دَيْنٌ فَلْيُؤَدِّ دَيْنَهُ حَتّٰى تَحْصُلَ اَمْوَالَكُمْ فَتُؤَدُّوْنَ عَنْهُ الزَّكَاةَ ۔

□ ... سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفانؓ اعلان کیا کرتے تھے کہ ماہِ زکوٰۃ آگیا ہے ۔ جس کے ذمہ قرض ہو وہ ادا کر دے تاکہ اس کا مال قرض کے بوجھ سے

آزاد ہو جائے اور تم اس میں زکوٰۃ ادا کر سکو۔

اس اثر سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تحصیل زکوٰۃ کے لیے ایک مہینہ مقرر تھا۔ اس عمل سے اصولی طور پر حولانِ حول کے مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں اور ضابطہ بندی ممکن ہو جاتی ہے۔

۱۶ - حدثني عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَيُّوبَ عن أَبِي تَمِيمَةَ السَّخْتِيَانِي أَنَّ عُمَرَ بْنَ عبد الْعَزِيزِ كَتَبَ فِي مَالٍ قَبَضَهُ بَعْضُ الْوُلَاةِ ظُلْمًا يَأْمُرُ بِرَدِّهِ إِلَى أَهْلِهِ وَيُؤْخَذُ زَكَاتُهُ لِمَا مَضَى مِنَ السِّنِينَ. ثُمَّ عَقَّبَ بَعْدَ ذَالِكَ أَنْ لَا يُؤْخَذُ مِنْهُ إِلَّا زَكَوٰةٌ وَاحِدَةٌ فَإِنَّهُ كَانَ ضِمَارًا۔

□ ... ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے کچھ مال کے بارے میں جن پر ان کے تحصیلداروں نے زیادتی سے قبضہ کر لیا تھا حکم دیا کہ مال ان کے مالکوں کو واپس کر دیا جائے اور اس میں سے پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ کاٹ لی جائے۔ پھر فوراً ہی دوسرا حکم بھیجا کہ اس میں سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے کیوں کہ مال ان کے قبضہ میں نہ تھا۔

ضمار اس مال کو کہتے ہیں جس کی وصولی مشتبہ ہو۔ مالک یہ نہ جانتا ہو کہ وہ وصول ہوگا یا نہیں۔ ایسے مال کے بارے میں تین رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ وصولی پر اس میں سے تمام سالوں کی زکوٰۃ لی جائے گی۔ دوسری یہ کہ صرف ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے گی جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ نے رجوع کے بعد کیا۔ تیسری رائے یہ ہے کہ ایک سال کی زکوٰۃ بھی نہیں لی جائے گی بلکہ وصولی کے بعد ایک سال گزرنے پر زکوٰۃ ہوگی۔ کیونکہ یہ مال دراصل قرضے کے حکم میں ہے جس پر وصولی کے بعد ایک سال گزرنا ضروری ہے۔ میری رائے میں یہی تیسری صورت صحیح ہے اور یہی جمہور کی رائے بھی ہے۔ امام مالک رحؒ کی رائے میں ایک سال کی زکوٰۃ لی جائے گی۔ ان کا فتویٰ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فتوے پر ہے۔

امام مالک رحؒ کے فتوے:

امام مالک سلیمان بن یسار رحؒ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ اس شخص پر زکوٰۃ عائد کرنے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے جس کے پاس مال ہو لیکن اس کی مانند اس پر قرض بھی ہو۔ میرے نزدیک یہ فتویٰ درست ہے۔

امام مالک صاحب قرض کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شخص اس وقت تک زکوٰۃ ادا نہ کرے جب تک کہ قرض اس کو وصول نہ ہو جائے۔ خواہ اس پر کئی سال گزر جائیں۔ لیکن جب بھی قرض وصول ہوگا تو اس کے اُوپر فوراً زکوٰۃ عائد ہوگی۔ میرے نزدیک اس صورت میں زکوٰۃ اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس مال پر ایک سال نہ گزر جائے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر قرض میں سے کچھ مال وصول ہو گیا لیکن وہ اتنا نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو تو اگر صاحب مال کے پاس اور مال بھی ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اس مال کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ میرے نزدیک یہ ایک واضح بات ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اس بات کی دلیل کہ کئی سالوں کے بعد وصول ہونے والے قرض پر صرف ایک ہی زکوٰۃ ہوگی، یہ ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ واجب ہو وہ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے گی، دوسرے مال میں سے نہیں نکالی جائے گی۔ جس طرح تجارتی سامان کسی کے پاس کئی سال رہتا ہے جب وہ اس کو بیچتا ہے تو اس پر صرف ایک ہی زکوٰۃ واجب ہے۔ میرے نزدیک یہ دلیل صحیح نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مال کی زکوٰۃ صرف اسی مال ہی میں سے نکالی جائے۔ عملاً یہ کلیہ نہیں چل سکتا۔ زکوٰۃ جنس کا خیال رکھتے ہوئے دوسرے مال سے بھی نکالی جا سکتی ہے۔ گندم یا جو دونوں ہوں تو گندم کی زکوٰۃ جو سے بھی پوری کر لی جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس بھیڑوں کی زکوٰۃ بکریوں سے لی جا سکتی ہے۔

اُس سامانِ تجارت کے متعلق جو کئی سال تک بیچا نہیں گیا، امام مالک رحؒ بکنے پر ایک زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ امام مالک رحؒ کا یہ فتویٰ بھی محل نظر ہے۔ اس سے احتکار کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس صورت میں مال کے مالک کو ثابت کرنا ہوگا کہ باوجود کوشش کے مال بک نہیں سکا۔ اگر وہ ثابت نہ کر سکے تو ہر سال کی زکوٰۃ وضع کی جائے گی۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔

(ترتیب: سعید احمد)

افاداتِ فراہی رحمہ
خالد مسعود

حکمت قرآن (۷)

نظامِ دین کی حکمت

حکمت کی تعبیر اس اساس پر ہوتی ہے کہ ہستی کے مختلف اجزا کے درمیان موافقت کی نوعیت معلوم ہو۔ یہ علم اس وقت حاصل نہیں ہوتا جب تک کائنات کے نظام کو نہ سمجھا جائے اور یہ نظام اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ اس کے تمام اجزا ایک ہی نظام کے اندر ہیں۔ دو یا دو سے زیادہ چیزوں میں جب باہم موافقت کے پہلو تلاش کیے جائیں تو اس موافقت کی ایک خصوصیت سامنے رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ مثلاً آپ زید کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوتے ہیں لیکن آپ کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی کہ وہ عمرو کا باپ بھی ہے۔ گویا کسی بھی نظام میں کسی چیز میں ہم آہنگی نہیں۔ یہ حقیقت بھی جانی پہچانی ہے کہ آپ ایک جملہ کے ہر جز کا موقع و محل اور تمام اجزا کی باہمی نسبت جانے بغیر جملے کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔ محض الفاظ کے معنی جاننا فہم کلام میں اس وقت تک مفید نہیں ہوتا جب تک کہ پورا جملہ سمجھ میں نہ آئے بلکہ جب تک آدمی جملے کے صحیح معنی کو اخذ نہ کرے اس میں استعمال ہونے والے الفاظ کے معانی تک بھی اس کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ٹھیک اسی طرح اس حکیم کو بھی مشکل پیش آتی ہے جو پوری کائنات کے نظام اور اس کے اندر موجود وحدت پر غور کر رہا ہوتا ہے۔

نظامِ کائنات کی وحدت:

کائنات میں صرف ایک ہی نظام اور ایک ہی مسلسل نعمت کا ظہور ہے۔ اس میں جو تضاد نظر آتا ہے یا تو وہ خیر ہی کو برآمد کرنے کے لیے ہے یا وہ جوڑوں جوڑوں میں موافقت کے سمجھنے کے باعث ہے جس کے نتیجے میں کائنات کے اندر پائے جانے والے فساد و شر کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اضداد کا حوالہ بہت دیا ہے لیکن ان کے جوڑے ملا کر بتایا ہے کہ ان اضداد سے کس طرح خیر کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک حکیم جب

اضداد پر غور کرتا ہے تو وہ بھی ان کی منفعت اور ان میں خیر کے پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہے۔ اس معاملہ میں قدماء کا طریقہ بھی یہی تھا اور ان کے بعد ہر زمانے کے حکما بھی اسی طرح غور کرتے رہے۔ حافظ نے کہا ہے ؎

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش
کہ من این مسئلہ بے چون و چرا می بینم

کائنات کا خالق کامل ہستی ہے:

کائنات میں جس ہستی کا وجود لازم ہے وہ صفت کمال رکھتی ہے جب محض وجود نہ چھپا رہ سکتا اور نہ بیکار رہ سکتا ہے تو پھر کامل ہستی کیسے معطل و مخفی رہ سکتی تھی۔ لہٰذا اس کا تقاضا ہوا کہ ایجاد کرے۔ ایجاد وہاں ہوتی ہے جہاں پہلے کچھ نہ ہو۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح حرکت کے تصور کے لیے پہلے سکون کا تصور ضروری ہے۔ پس قدیم ذات نے عدم کو وجود کا، سکون کو حرکت کا، تاریکی کو روشنی کا، کمزوری کو قوت کا، پستی کو بلندی کا اور تغیر کو اختیار کا جامہ پہنایا۔ اس نے تخلیق کیا، اشیاء کو نمودار کیا، خلق پر شفقت اور کرم کیا، اس کو علم اور عزت دی۔ اس نے انسان کے اندر علم اور جہالت، محبت اور بغض، سخاوت اور بخل جیسی متضاد صفات کا امتزاج رکھا جس کے باعث اس کو کوشش، محنت اور مشقت اور ترقی اور نشوونما کا وسیع میدان میسر آگیا۔ پس ناقص کے لیے کمال، کمزور کے لیے قوت، جہالت کے مقابلہ میں علم اور شک کے مقابلہ میں یقین کا حصول مقصود قرار پایا۔ لیکن اولین ہستی ہی آخری ہستی بھی ہے اور باقی سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس بات کو یوں فرمایا:

وَإِلَى اللهِ الْمَصِيرُ — اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ (آل عمران ۱۸۰) — اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز سے پہلے تھا۔ باقی سب اسی کی مخلوق ہے۔ یہ سب اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ان سب کا آغاز اسی کی جانب سے ہے اور وہی ان کا مقصود ہے۔

کامل وجود کے لیے لازم ہے کہ وہ قدیم، باقی رہنے والا، ازلی اور ابدی ہو،

کی قوت اور بالیدگی کمال کو پہنچی ہوئی ہو لہٰذا اس نے جو کچھ چاہا وہ خیر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے وہ خوبصورت ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے [illegible] کرتا ہے۔ پھر جس طرح ہستی اس پر ختم ہوتی ہے اسی طرح خیر و خوبی بھی اس پر ختم ہے۔ اگر یہ بات نہ مانی جائے تو اس کے وجود کا کمال مجروح ہوتا ہے۔ پس:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الحدید ۳)

وہی اول بھی ہے وہی آخر بھی اور ظاہر بھی اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

نظامِ دین کی حکمت کی ضرورت:

اس بنیاد پر اب دین کے معاملہ پر نگاہ ڈالیے۔ دین اگر صحیح ہو تو لازماً اس کا نظام بھی صحیح ہونا چاہیے۔ نظام کے صحیح ہونے سے مراد یہ ہے کہ دین کے عقائد و اعمال کے درمیان، دین اور فطرت انسانی کے درمیان اور دین اور کائنات کے درمیان کامل موافقت ہو۔ جب یہ سب موافقتیں صحیح ہوں گی تو ایسا دین پُرحکمت، فطری اور سیدھا سادا ہوگا جو رحیم و حکیم رب کی راہ دکھاتے گا۔ اور جو شخص اس کی حکمت سے واقف ہو کر اس کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے گا، وہ نور بصیرت پر ہوگا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عالم کی ایک ایسے عبادت گزار پر فضیلت کیوں بتائی گئی ہے جس کی ظاہری عبادت میں کوئی خلل یا نقص نہیں ہوتا۔ اس کی یہ وجہ ہرگز نہیں ہے کہ عابد فرائض و سنن اور اوامر و نواہی کے جاننے میں عالم کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسے علم کے بغیر تو عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عابد ظاہری احکام کا عالم تو ہوتا ہی ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہوتا تو دین کی حقیقتوں کا عالم نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اپنے رب کی عبادت اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک بت پرست، ایک مجوسی، ایک یہودی یا ایک نصرانی کرتا ہے۔ اس کے تمام معاملات بدگمانی اور بدحالی کے ساتھ ہوتے ہیں، اس کے اخلاق و احسان کمزور ہوتے ہیں، وہ اکثر اس چیز کی آرزو کرتا ہے جس کے پورا کرنے سے اللہ شرماتا ہے، وہ اللہ سے ایسا گمان رکھتا ہے جو کسی مہذب اور شریف آدمی کو بھی پسند نہیں، چہ جائیکہ رب سبحانہٗ و تعالیٰ

ہے وہ گمان کیے جائیں۔ یہاں ان بدگمانیوں کی تفصیل ممکن نہیں۔ بس یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دین کی حکمت جاننے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی ایک بے خبر آدمی گمان کر سکتا ہے۔

اپنے اس مقالہ میں ہم دین اسلام کی حیثیت کلی پر روشنی ڈالیں گے، خارج سے اس کی نسبت کو بیان کریں گے اور اس کے داخلی اجزا کی باہمی نسبتوں اور ان کی تقدیم و تاخیر کے مواقع کی وضاحت کریں گے تاکہ ان کے اجزا کا باہمی ربط اور خارج کے ساتھ ان کی موافقت معلوم ہو۔ اور ہم یہ بیان کریں گے کہ حق کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے ٹکراتے نہیں ہیں:

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (الملک ۳)

تم خدائے رحمان کی صنعت میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔ نگاہ دوڑاؤ تو کیا تمہیں کوئی نقص نظر آتا ہے؟

پس ہم قرآن اور فطرت انسانی کے درمیان توافق، خلق اور امر کے درمیان توافق اور رب عزیز و حکیم اور انسان جس کو اس نے بہترین ساخت عطا فرمائی ہے، کے درمیان تعلق کو واضح کریں گے۔ اس سے نتیجے کے طور پر انسان اور تمام مخلوقات کے درمیان تعلق معلوم ہوگا جیسا کہ قدیم فلاسفر کہتے ہیں کہ انسان عالم اکبر ہے۔ لیکن ہم یہ توافق اپنی تاویل کے مطابق بتائیں گے جس میں ارادہ کرنے والے اور اس کے ارادہ کے درمیان، فعل اور اس کے مقصد کے درمیان، مفعول اور اس کے ذریعہ کے درمیان، ذات اور اس کی صفات کے درمیان اور جو چیز طاقت میں ہوتی ہے اور جو عملاً ظاہر ہوتی ہے اس کے درمیان موافقت واضح کریں گے۔ کیونکہ انسان کا موقف دو حالتوں کے درمیان رہتا ہے، یا تو وہ موافقتوں کے وجود کا انکار کر دے گا یا وہ ان کا یقین رکھے گا۔ البتہ ان موافقتوں کے اجزا کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی کو ان کی باہمی نسبت معلوم نہ ہو۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نظام کی پہچان سے تعبیر کیا ہے

ہدایت و ضلالت:

قرآن نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ حقیقی دین صرف اسلام ہے اور یہی اصل فطرت

ہے ۔ اسی طرح اس نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ قرآن اصلی ہدایت ہے یعنی رب کی راہ دکھاتا ہے اور دینِ فطرت کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ اس طرح اس نے قرآن اور انسان کے درمیان موافقت اور خلق اور امر کے درمیان موافقت کو واضح کیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا :

أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ — اس نے ہر چیز کو اس کی خلقت عطا فرمائی پھر اس کی رہنمائی کی ۔
(طٰہٰ : ۵۰)

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ — جس نے خاکہ بنایا پھر نوک پلک سنوارے ۔ جس نے مقدر کیا اور ہدایت بخشی ۔
(الاعلیٰ : ۲-۳)

آیت میں لفظ سوّیٰ آیا ہے ۔ تسویہ یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز کے تمام اجزا کو ایک دوسرے کے لیے موزوں اور مناسب اور ایک مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا جائے تاکہ اس کے بعد ان کے استعمال سے اس مقصد کو پورا کیا جا سکے ۔ خلقت کو خوب بنانے اور محکم کرنے کا مفہوم بھی یہی ہے جیسا کہ ان آیات میں ہے ۔

أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ — اس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے ۔
(السجدہ : ۷)

أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل : ۸۸) — اس نے ہر چیز کو محکم کیا ۔

آیات کے یہ مفہوم نہایت واضح ہیں ۔ اسی میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ جس ذات نے پیدا کیا اسی نے ہدایت کا سامان بھی کیا ۔ اور جب وہ ہدایت دیتا ہے تو وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو ۔ لہٰذا فرمایا :

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۔ — آگاہ! خلق اور امر اسی کے لیے خاص ہے ۔
(الاعراف : ۵۴)

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر کوئی ہدایت انسان کی اس ساخت اور فطرت کے موافق ہے جس پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے تو وہ اللہ کی ہدایت ہے اور اس کے راستہ اور ارادہ کی نشان دہی کرتی ہے مزید اس نے ہمارے نفوس کے اندر اس کی پہچان بھی رکھ دی ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت میں هَدَىٰ کے معنی یہ ہیں کہ خالق نے جس طرح ہر شے کو کسی نہ کسی نفع اور استعمال کے لیے پیدا کیا اسی طرح اس نے جن مقاصد کے لیے وہ شے بنائی

ان کے حصول کے لیے اس کو رہنمائی بھی عطا کی ۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ انسان کو ہر شے کی تفصیل کا علم بھی ہو ۔ اس کے لیے اولاً اتنی بات کافی ہے کہ وہ ان مناسبتوں کو جانتا ہو جو اس کے اور اس شے کے درمیان پائی جاتی ہیں وہ ان کو جمع کرکے ایک لڑی میں پرو لے ۔ ثانیاً تفصیل سے اتنا آگاہ ہو جتنا اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کے لیے وہ اس کا محتاج ہے اس طرح وہ کائنات کی دوسری تمام اشیاء کی طرح اس ذات کے ارادہ کے مطابق چل سکے گا جس کی گرفت میں ساری کائنات کی باگ ہے ۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ — ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے ۔
(یٰسٓ : ۴۰)

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ — کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا ۔
(الاسراء : ۸۴)

اگر انسان اس علم کے خلاف چلے تو وہ اپنی فطرت کی مخالفت کرتا اور اپنے خالق کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے ۔ البتہ وہ خالق کے بنائے ہوئے منضبط نظام سے باہر نہیں نکل سکتا اور نہ اس کے امر پر غلبہ پا سکتا ہے ۔ کیونکہ خالق نے جس طرح ہر مخلوق کے لیے ایک اندازہ ٹھیرایا ہے اسی طرح اس نے انتظام بھی ٹھیرا رکھا ہے ۔ اس نے انسان کو اختیار دیا خیر اور شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت تو دے دی لیکن خیر و شر میں سے کسی ایک پر اس کو مجبور نہیں کیا اگرچہ وہ ایسا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن چونکہ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار بنایا تھا ۔ اب اگر وہ اس کو کسی بات پر مجبور کرتا تو وہ خود اپنے پُرحکمت اور پُرشفقت ارادہ کے خلاف کرتا اور انسان کو اس نے جو آزادی عطا کی تھی اور اپنا قرب اس کو عنایت کرنے کے لیے اس کی آزمائش کا جو نظام بنایا تھا وہ خود اس کو توڑ دیتا ۔ اس کے برعکس اگر انسان خود ہی اپنی فطرت کی نافرمانی کرتا اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹتا ہے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کے لیے خود اختیار کیا ۔ البتہ اس طرح خالق کا ارادہ پورا ہو جاتا ہے ۔

ہدایت و ضلالت کا یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لیے مزلّہ قدم ثابت ہوا ہے اور مذاہب پر اس کے اثرات نہایت گہرے پڑے ہیں ۔ اس پر نہایت تفصیل سے کلام کرنے کی ضرورت ہے ۔ لیکن اس کے لیے یہ مناسب موقع نہیں ۔ یہاں اس سے صرف اس بات کی

وضاحت مقصود ہے کہ ایک حکیم کے لیے کائنات اور اپنے نفس کی معرفت ضروری ہے تاکہ وہ اس نظامِ کلی کو جان سکے جس کے تحت دین کا نظام آتا ہے۔

مقصدِ حیات و کمالِ سعادت:

نفسِ انسانی کی جد و جہد کی غایت دو چیزیں ہیں، ایک ان قوتوں اور صلاحیتوں میں کمال حاصل کرنا ہے جو اس کو ودیعت کی گئی ہیں۔ دوسری اس مقصد کو پانا جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

جو چیزیں ودیعت کی گئی ہیں اور ان کی تکمیل مقصود ہے۔ وہ علم و عمل کی دو قوتوں اور فہم و اخلاق کو نشو و نما دینا ہے۔ علم اور فہم کا کمال یہ ہے کہ آدمی نور و ظلمت، حق و باطل اور ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے لگے اور عمل و اخلاق کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مادی جسم کی گھٹیا چاہتوں سے بلند ہو کر اپنی روح کی اعلیٰ پسند کو اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کو ہدایت و ضلالت میں فرق کرنے کی صلاحیت دی ہے جیسا کہ اس کو نیکی کے کام کرنے اور گھٹیا فانی چیزوں پر اعلیٰ اور پائیدار چیزوں کو ترجیح دینے کے اسباب سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتیں عطا کیں۔ پھر اس کی طرف روشنی اتاری اور رسول بھیجے جبکہ اس کو اتنی صلاحیت دے رکھی تھی کہ جو چیز اس کے آگے رکھی جائے وہ اس کو پہچان سکے۔ اگر وہ نفس کی فطرت کے مطابق اس کو اسباب فراہم نہ کرتا تو انسان اس پیغام کے قبول کرنے کا مکلف نہ ہوتا جو اس کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو مقصود مقرر کیا ہے وہ اپنے رب کی اطاعت اور خواہ ناگواری کے ساتھ ہی ہو اس کے فیصلہ پر راضی رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رب کے قرب کے لیے اپنے وجود کے تقاضوں سے بھی دستبردار ہو جائے۔ جب نفسِ انسانی اسی حالت میں اطمینان پائے اور اسی پر راضی ہو جائے تو اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات اس کی عبادت کرتی ہے لیکن انسان جب عبادت کرتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی ساخت کے مخالف بات ہوتی ہے اس لیے اس کی یہ جد و جہد اور محنت نہایت کامل اور بڑی ہوتی ہے۔ اس کی شان یوں ہے جیسے وہ اپنے رب کی امانت کو ادا کرنے کے لیے ایک ایسی راہ پر چل رہا ہو جس میں چوروں، درندوں، رکاوٹوں اور پھسلن سے

بھرا ہوا ہو بلکہ اس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اپنے وجود کی مخالفت کے باوجود اپنے رب کی طرف چل پڑا ہو، وہ خود اپنے نفس کا دشمن ہو جائے، اس کے ساتھ نقصان کرے اور اس پر نامہربان ہو جائے پھر اس کو قتل کر کے اپنے مولیٰ کے آگے ڈال دے۔

اوپر ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے آیتِ امانت

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا۔ (الاحزاب ۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کی تحمّل سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بیشک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔

کی تاویل روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انسان کی طبیعت کا یہ گھٹیا پہلو ہی ہے جو اصل میں اس کے تقرب کا موجب ہوا ہے۔ کوئی مجاہد اس وقت تک مجاہد نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی ایسا دشمن نہ ہو جس پر وہ غلبہ پانے کی جد و جہد کرے۔ کوئی مقرب بندہ اس وقت تک مقرب نہیں کہلاتا جب تک وہ قربانی کو ذبح نہ کرے۔ یہاں قربان کی جانے والی چیز نفس اور اس کی خواہش ہوتی ہے پس کسی دوسری مخلوق کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی وہ عزت ہو سکتی ہے جو اس کی عزت ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کو تخلیق کرنے کے بعد اس کے اپنی طرف عروج کے لیے ایک زینہ مقرر فرما دیا اور اس کو فہم اور اختیار کی آزادی کی جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں اس کی ابتلا رکھ دی۔

ابتلا کی حکمت:

انسان کی ابتلا آرام و آسائش اور تکلیف دونوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی اس کا شاکر بھی جانچا جاتا ہے اور صابر بھی۔ شکر کی صورت میں وہ خلق کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے۔ اسی بے ناشکری کی تعبیر قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَ

ہرگز نہیں بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر ایک دوسرے

تَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَ تُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔ | کو ابھارتے، اور وراثت کو سمیٹ کر ہڑپ کرتے ہو۔ اور مال کے عشق میں متوالے ہو۔

(الفجر ۱۷–۲۰)

صبر کی صورت میں انسان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی طرف خیر کو واپس لانے والا رب تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی اپنی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کرے تاکہ وہ اس کو بدل عطا فرما سکے۔ اس حقیقت کو یوں فرمایا:

وَإِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ | اور جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

(البقرہ ۱۵۶)

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ | جو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے ان کو ان کا صلہ بے حساب پورا کیا جائے گا۔

(الزمر: ۱۰)

پس صبر ترقی کا زینہ ہے اور شکر اخلاص، عبادت گزاری، دعا اور عاجزی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب ایک بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کا رب نہایت رحیم و کریم ہے تو وہ اس کے فیصلہ پر راضی ہو جاتا اور اس کی راہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث کرتا ہے، وہ اس کی طرف سکون پاتا ہے، دوسرے بندوں کے لیے شفقت کے جذبات رکھتا ہے اور یہ سب کچھ اطاعت کے جذبہ سے کرتا ہے تاکہ اپنے رب کو راضی کر لے۔ صبر و شکر کی دو بنیادی صفات میں جس قدر غور کیا جائے یہ حقیقتیں اسی قدر کھلتی جاتی ہیں۔

بحث و نظر

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی

قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ؟

ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور کے اگست ۱۹۸۸ء کے شمارے میں جناب میاں محمد شوکت صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اپریل و مئی ۱۹۸۸ء کے شماروں میں "قرآن میں اصحاب فیل کا واقعہ" کے عنوان سے ادارہ معارف اسلامی منصورہ کے جناب محمد رفیق چوہدری صاحب کا جو مضمون چھپا ہے اس میں غیر ضروری جوش و خروش اور غیظ و غضب کے زیر اثر اختلاف و تنقید کے حدود و آداب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اور اس میں حضرت مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں وہ لہجہ اختیار کیا گیا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ انہیں مولانا علیہ الرحمۃ کی رائے سے اختلاف کا حق تو حاصل تھا لیکن اس اختلاف میں ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری تھا۔

یہ مراسلہ اس مجلہ کے تقریباً ساڑھے چار صفحات پر پھیلا ہوا ہے مگر مراسلہ نگار نے اس میں کہیں بھی سنجیدگی و متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس کے برعکس بڑی خوبصورتی سے مضمون کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے ہوئے بس یہ شکایت کی ہے کہ مولانا علیہ الرحمۃ کو محض اتنی سی بات پر متجددین کی فہرست میں شامل کرنا کسی طرح جائز نہیں تھا۔

اس مراسلہ کے ساتھ اس کا جواب بھی اسی شمارے میں چوہدری صاحب ہی کے قلم سے شائع ہو گیا تھا جو درج ذیل ہے:

"میں عرض کروں گا کہ وہ تمام لوگ جو درج ذیل نظریات رکھتے ہیں، میرے نزدیک متجددین اور منکرین حدیث میں شامل ہیں:

۱۔ جو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتے
۲۔ جو احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے اجتماعی طور پر مسلمہ اصولوں کو چھوڑ کر اپنے کچھ خود ساختہ

اصول رکھتے ہیں اور جن کے ذریعہ وہ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے کا اعتقاداً اور عملاً انکار کرتے ہیں۔

۳۔ جو اجماع امت کے شرعاً حجت ہونے کے منکر ہیں۔

۴۔ جو قرآن مجید میں مذکورہ معجزات انبیاء کی اس طرح تاویل و توجیہ کرتے ہیں کہ ان کا اعجازی پہلو بالکل ختم ہو جاتا ہے اور وہ عام معمول کے طبعی واقعات یا پھر اتفاقات زمانہ معلوم ہوتے ہیں۔

۵۔ جو اسلامی تعلیمات و احکامات کی مسلم تعبیرات سے ہٹ کر ان کی ایسی تعبیریں اور تاویلیں اختیار کرتے ہیں جن کے بعد انہیں جدید عقلیت پسند ذہن کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

میں یہ بات پورے شرح صدر کے ساتھ اور علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ واقعۂ اصحاب فیل کی تاویل نو کے اصل موجد اور اس کے پیروکاروں کو میں نے درج بالا گروہ کن نظریات کا حامل پایا ہے اس لیے میں ان لوگوں کو متجددین اور منکرین حدیث کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنے مضمون میں ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا تھا"

یہ ہے وہ وضاحت جو اس مراسلے کے جواب میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئی ہے اس وضاحت سے معلوم نہیں مراسلہ نگار کی تشفی ہوئی یا نہیں البتہ مدیر مجلہ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کے نام جو مراسلہ بھیجا گیا تھا اس کا جواب شائع ہو گیا چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے ان کلمات کے ساتھ یہ جواب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

"میں نے مناسب یہی سمجھا کہ جس مضمون پر اعتراض ہے اس کے لکھنے والے دوست ہی خود جواب دیں۔"

جناب نعیم صدیقی صاحب ہمارے قابل احترام بزرگ ہیں۔ تحریک اسلامی کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ وہ مدرسۂ مودودی کے مایہ ناز فرزندوں میں سے ہیں۔ علم و فضل اور اسلامی غیرت و حمیت کے لحاظ سے وہ ہمارے درمیان معروف ہیں۔ اس لحاظ سے ہمیں بجا طور پر ان سے امید تھی کہ وہ اس موقع پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے لیکن بدقسمتی سے ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ کی شخصیت ان کے لیے نئی نہیں ہے۔ خود مولانا مودودی کے گہربار اور حقیقت نگار قلم سے ترجمان القرآن میں بارہا ان کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے ایسا غیر معیاری اور غیر علمی مضمون ترجمان القرآن میں شائع کیسے ہوا اور اگر غفلت میں شائع ہو گیا تو شوکت صاحب کے توجہ دلانے پر بھی اس غلطی کی تلافی کیوں نہیں کی گئی؟ اور اگر کسی وجہ سے مراسلہ کا جواب چودھری بہادر سے ہی لکھوانے کا فیصلہ کیا گیا تو کم از کم ان کا جواب باصواب

سامنے آجانے کے بعد بحیثیت ایڈیٹر خود اپنی ذمہ داری کیوں نہیں محسوس کی گئی؟

چودھری بہادر کا اصل مضمون "قرآن میں اصحاب فیل کا واقعہ" اپنے اندر کتنا وزن اور کتنی معقولیت رکھتا ہے اس کا جائزہ تو ہم آئندہ لیں گے، سردست ہم انہی نکات تک اپنی یہ گفتگو محدود رکھنی چاہتے ہیں جن کی طرف آنجناب نے اپنے تازہ جواب میں اشارہ فرمایا ہے اور جن کی بنیاد پر ترجمان القرآن علامہ حمید الدین فراہیؒ اور ان کے خوشہ چینیوں کے خلاف تجدد اور انکار حدیث کا فتویٰ صادر کرنا ضروری سمجھا ہے۔

پہلی دفعہ:

امام فراہیؒ اور ان کے تلامذہ پر آنجناب نے جو پہلی دفعہ عائد کی ہے وہ یہ ہے:

"جو سنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتے"

یہاں چودھری بہادر سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ یہ کسوٹی جو آپ نے مقرر فرمائی ہے اس کے لیے خود آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ سنت کے مستقل بالذات ماخذ قانون ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا قرآن و سنت دو متوازی خطوط ہیں جو کہیں ایک دوسرے سے ملتے نہیں؟ اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی مستقل حیثیت ہے؟ کیا یہ دو الگ الگ شریعتیں ہیں جن کے ہم پابند کیے گئے ہیں؟

ہم نے جہاں تک پڑھا اور سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں قرآن کے مبلغ اور شارح و ترجمان کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ اس طرح جو کچھ آپ نے کیا ہے یا فرمایا ہے وہ قرآن ہی کی تشریح یا اسی کی عملی تطبیق تھی۔

صحابہ و تابعین کا نقطۂ نظر:

اسی بات کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہایت مختصر اور بلیغ انداز میں یوں فرمایا ہے: کان خلقه القرآن "آپ کا گفتار، آپ کا کردار، آپ کا ایک ایک بول اور ایک ایک ادا قرآن پاک ہی کی آئینہ دار تھی"۔

اسی بات کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اور زیادہ واضح لفظوں میں یوں فرمایا ہے:

اذا حدثتكم بحديث انباتكم بتصديقه من كتاب الله۔	میں کوئی بھی حدیث تم سے بیان کروں، قرآن پاک میں اس کی تائید تم کو دکھلا سکتا ہوں۔

اسی سے ملتا جلتا حضرت سعید بن جبیر کا مشہور قول ہے ؛

ما بلغنی حدیث علی وجهه الا وجدت مصداقه فی کتاب الله تعالیٰ ۔

مجھ تک جب بھی کوئی حدیث پہنچی ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں مجھے اس کی تائید مل گئی ہے۔

امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر :

اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے ۔

جمیع ما تقوله الائمة شرح للسنة وجمیع السنة شرح للقرآن

ائمہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سنت کی شرح ہے اور پوری سنت قرآن کی شرح ہے ۔

ایک اور موقع پر وہ فرماتے ہیں :

کل ما حکم به رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو مما فهمه من القرآن لقوله صلی الله علیه وسلم انی لا احل الا ما احل الله فی کتابه ولا احرم الا ما حرم الله فی کتابه ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلے کیے ہیں وہ قرآن سے مستنبط کیے ہوئے ہیں کیوں کہ آپ نے فرمایا : میں بس وہی چیزیں حلال ٹھہراتا ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا ہے اور وہی چیزیں حرام قرار دیتا ہوں جنہیں اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے ۔

خلیفۂ ثانی کا فیصلہ کن ارشاد :

صحیح بخاری کی ایک مشہور روایت سے بھی ہمیں اس سلسلے میں واضح راہنمائی ملتی ہے ۔ وہ روایت یہ ہے :

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال : لما حضر رسول الله صلی الله علیه وسلم و فی البیت رجال

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا اور اس وقت گھر میں

---

[1] قواعد التحدیث : از علامہ محمد جمال الدین قاسمی ص ۵۹ ، دار الاحیاء الکتب العربیۃ ۔ ۱۳۸۰ھ

فقال النبی صلی الله علیه وسلم هلموا اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده فقال بعضهم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قد غلبه الوجع وعندکم القرآن ۔ حسبنا کتاب الله ۔ [1]

بہت سے لوگ تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : آؤ میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھ دیتا ہوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہوگے ۔ ان میں سے کسی نے کہا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکلیف کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہی ہے ۔ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے ۔

دوسری روایتوں میں یہ صراحت ہے کہ یہ کہنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سنت قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون ہے تو اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کا ذکر کیوں نہیں فرمایا؟ اور بس اتنا ہی کہنے پر کیسے اکتفا کر لیا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے ۔

پھر اگر ان کی یہ بات ادھوری رہ گئی تھی تو دوسرے اجلہ صحابہ نے اس کی تکمیل یا تصحیح کیوں نہیں فرمائی ؛ پھر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں صحابہ کرام سے جو آخری خطاب فرمایا تھا اس میں یہ اضافہ بھی تھے : انی لم احل الا ما احل القرآن ولم احرم الا ما حرم القرآن [2] " میں نے انہی چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے جن کو قرآن نے حلال ٹھہرایا ہے اور بس انہی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے "

امام شاطبیؒ کی توضیح :

امام شاطبی اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

سنت اپنے معنی و مفہوم میں قرآن کے تابع ہے ۔ کہیں یہ اس کے اجمال کی تفصیل ہوتی ہے کہیں اس کے مشکل مقام کی توضیح ہوتی ہے اور کہیں اس میں ان بات مختصر ہوتی ہے تو یہ اس کی شرح و بسط

---

[1] باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و وفاتہ ۔ [2] امتاع الاسماع للمقریزی ۱/۵۴۶ ت ۔ محمود محمد شاکر شئون الدینیۃ ۔ قطر ۔

[3] سیرت ابن ہشام ۴/۶۵۲ تحقیق مصطفی السقا ، ابراہیم الابیاری ، عبد الحفیظ شلبی

کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ سنت اصل میں قرآن کی تو تبیین ہے۔ یہی بات ہے جو اس فرمانِ الٰہی سے معلوم ہوتی ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ اور ہم نے تمہاری طرف یہ ذکر اتارا ہے تاکہ لوگوں کے لیے واضح کردو اس چیز کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

چنانچہ تم سنت میں کوئی ایسی بات نہیں پاؤ گے جس کی قرآن نے نشان دہی نہ کر دی ہو اجمال کے ساتھ یا تفصیل کے ساتھ۔ پھر ہر وہ چیز جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ قرآن ہی شریعت کی اصل اور اس کا سرچشمہ ہے وہ اس مسئلہ زیر بحث کی بھی دلیل بنے گی۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ" حضرت عائشہؓ نے اس کی تعبیر یہ فرمائی ہے کہ آپ کا خلق قرآن تھا۔ آپ کے خلق کے سلسلہ میں انھوں نے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے جو کچھ کہا یا کیا، یا جس قول و فعل کو آپ نے سند جواز عطا کیا، ان سب کا مرجع و ماخذ قرآن تھا۔ اس لیے کہ خلق میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر چیز کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ اجمالی طور پر سنت بھی اس میں داخل ہو۔ کیونکہ امر و نہی قرآن کی اولین چیز ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ) "ہم نے قرآن میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے"۔ اسی طرح خدا کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن اتار کر آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اس طرح خلاصہ یہ نکلا کہ قرآن میں جو کچھ ہے سنت اسی کا بیان ہے اور یہی مطلب ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ سنت قرآن کے تابع ہے"[1]

اس ساری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ سنت کے قرآن مجید کی طرح مستقل بالذات ماخذ قانون ہونے کا نظریہ ایک باطل نظریہ ہے جسے حقیقت و واقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ خالص

---

[1] الموافقات۔ امام شاطبی ۴/۶

ایک جذباتی نعرہ ہے جس کے پیچھے دلیل و برہان کی کوئی قوت نہیں۔

دوسری دفعہ:

دوسری دفعہ جو استاذ امام اور ان کے تلامذہ پر عاید کی گئی ہے یہ ہے:

"یہ احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے اجتماعی طور پر مسلمہ اصول کو چھوڑ کر اپنے کچھ خود ساختہ اصول رکھتے ہیں اور جن کے ذریعہ وہ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے کا اعتقاداً اور عملاً انکار کرتے ہیں۔"

ہمیں نہیں معلوم کہ احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے کون سے مسلمہ اصول ہیں جن کو امام فراہی نے چھوڑا ہے اور کون سے وہ خود ساختہ اصول ہیں جن پر قبضہ۔ چودھری صاحب کو اعتراض ہے۔ چودھری بہادر کے الفاظ سے ہمیں تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کی معلومات کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہیں۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ روایات کو جانچنے پرکھنے کے وہ کیا اصول ہیں جو علمائے اصول نے وضع کیے ہیں۔ وہ بس یہ جانتے ہیں کہ کوئی روایت اگر کسی مجموعۂ احادیث و سنن میں درج ہوگئی ہے اور علمائے جرح و تعدیل نے سنداً اس کو رد نہیں کیا ہے، تو محض یہ بات اس کی صحت کے لیے کافی ہے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ان اصولوں کا بھی مختصراً بیان تذکرہ کر دیا جائے جو اہلِ فن کے نزدیک مسلّم رہے ہیں اور ناقدینِ حدیث جن کی ہمیشہ رعایت کرتے رہے ہیں۔

قبولِ حدیث کی شرطیں:

امام ابن کثیرؒ جو ایک بلند پایہ محدث و مورخ اور ایک عظیم المرتبت مفسر تھے کسی روایت کو موضوع قرار دینے کے لیے درج ذیل باتوں میں سے کسی ایک بات کا ہونا کافی سمجھتے ہیں۔

(۱) اقرار وضعه على نفسه قالا او حالا (۲) ركاكة الفاظه (۳) فساد معناه (۴) مجازفة فاحشة (۵) مخالفة لما ثبت فى الكتاب والسنة الصحيحة۔

(۱) خود حدیث کا گھڑنے والا اس بات کا اعتراف کرے، چاہے زبانِ قال سے یا زبانِ حال سے۔ (۲) روایت کے الفاظ بھدے ہوں (۳) روایت کا مضمون فاسد ہو (۴) بالکل اوٹ پٹانگ بات

معلوم ہوتی ہو (۵) قرآن یا حدیث صحیح کے مخالف بات ہو۔ [1]

امام سیوطی نے اپنی کتاب (تدریب الراوی) میں اس سلسلے میں امام ابن جوزی کا یہ قول نقل کیا ہے:

ما احسن قول القائل: اذا رأیت الحدیث یباین المعقول او یخالف المنقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع۔ [2]

کسی کہنے والے نے کتنی اچھی بات کہی ہے: جب تم کسی حدیث کو دیکھو کہ وہ عقل سے بعید ہے یا دوسری احادیث کے خلاف ہے یا دین کے اصولوں سے ٹکراتی ہے تو سمجھ جاؤ وہ گھڑی ہوئی ہے۔

خطیب بغدادی نے ابوبکر بن الطیب کا یہ قول نقل کیا ہے:

• اگر کوئی روایت کسی نہایت عظیم اور مہتم بالشان معاملہ یا واقعہ کی خبر دیتی ہے اور وہ معاملہ یا واقعہ ایسا ہے کہ اس کے راوی بہت سے ہونے چاہئیں لیکن روایت صرف ایک ہی راوی کے واسطہ سے آتی ہے تو یہ بات بھی اس روایت کو موضوع قرار دینے کے لیے کافی ہے۔

اگر کسی چھوٹی سی بات پر بڑی سخت وعید آئی ہے یا کسی حقیر سے کام پر بہت بڑے اجر کا وعدہ ہے تو یہ چیز بھی اس روایت کے موضوع ہونے کی علامت ہوگی۔ [3]

اگر کوئی خبر واحد کوئی ایسی اطلاع دیتی ہے جس سے مطلع ہونا سب کے لیے ضروری ہے مثلاً کسی روایت سے یہ معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی تھی تو اس طرح کی روایت واجب الرد ہوگی وہ کبھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ خبر واحد علم یقین کا فائدہ نہیں دیتی اور اس لیے بھی کہ اس طرح کی باتیں فوراً پھیل جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے نقل ہوتی جاتی ہیں تو اب اگر کوئی ایک ہی راوی اس طرح کی بات نقل کرے تو وہ جھوٹا سمجھا جائیگا۔ [4]

ربیع بن خثیم کہتے ہیں:

---

[1] اختصار علوم الحدیث للامام ابن کثیر معہ شرحہ: الباعث الحثیث للاستاذ احمد محمد شاکر مصری

[2] تدریب الراوی للامام السیوطی - ص ۲۷۷

[3] ملاحظہ ہو: الباعث الحثیث: ۸۳

[4] التمہید فی اصول الفقہ ۳/ ۱۵۰، از علامہ ابوالخطاب الکلوذانی الحنبلی (۴۳۲ھ - ۵۱۰ھ)

ان للحدیث ضوءاً کضوء النهار تعرفه، وظلمة کظلمة اللیل تنکره [1]

حدیث کی ایسی روشنی ہوتی ہے جیسے دن کی روشنی، تم اسے بآسانی پہچان لوگے اور ایسی تاریکی ہوتی ہے جیسے رات کی تاریکی کہ تم کو اس سے وحشت ہوگی۔

امام ابن جوزی فرماتے ہیں:

الحدیث المنکر یقشعر له جلد الطالب للعلم، وینفر منه قلبه فی الغالب [2]

غلط حدیث سے عموماً طالب علم کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس سے اس کے دل کو وحشت ہوتی ہے۔

امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں:

خبر الواحد اذا تکاملت شروط صحته هل یجب عرضه علی الکتاب؟ قال شافعی رحمة الله علیه: لا یجب لانه لا تتکامل شروطه الا وهو غیر مخالف للکتاب. وعند عیسٰی ابن ابان: یجب عرضه علیه، لقوله صلی الله علیه وسلم (اذا روی لکم حدیث فاعرضوه علی کتاب الله تعالٰی فان وافقه

خبر واحد میں اگر صحت کی تمام شرطیں پائی جا رہی ہیں تو کیا اس صورت میں بھی قرآن کی کسوٹی پر اسے پرکھنا ضروری ہوگا: شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ اس میں وہ تمام شرطیں پائی ہی نہیں جا سکتیں جب تک کہ وہ قرآن کے موافق نہ ہو۔ اور عیسٰی بن ابان [3] رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہوگا کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: جب تم سے کوئی حدیث میرے حوالے سے بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھو، اس کے

---

[1] الباعث الحثیث: ۸۲ [2] ایضاً: ۸۳

[3] عیسٰی ابن ابان ایک بلند پایہ محدث اور ایک بالغ نظر فقیہ تھے۔ کئی سال تک بصرہ کے قاضی رہے اور ۲۲۰ھ میں بصرہ ہی میں وفات پائی۔ کتاب اثبات القیاس، کتاب الحج اور الجامع جیسی بلند پایہ علمی کتابوں کے مؤلف تھے۔

فاقبلوہ والا فردوہ[1] مطابق ہو تو لے لو ورنہ رد کردو۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کی روایات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ محض اس کے وجوب کا انکار کر رہے ہیں۔ بایں دلیل کہ کسی روایت میں اگر صحت کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں تو وہ قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اطمینان خاطر کے لیے اگر کوئی اس طریقہ کی روایات کو بھی قرآن کی کسوٹی پر پرکھتا ہے تو وہ ان کے نزدیک قابل ملامت نہیں بلکہ لائق ستائش ہے۔

(جاری ہے)

(تشکر یہ حیات نو بلبریا گنج)

---

[1] المحصول فی علم اصول الفقہ: امام رازی دراسۃ وتحقیق د/طہ جابر، الجزء الثانی القسم الاول ص ۶۲۸ ۶۲۶

بقیہ : اسالیبِ قرآن

ہے کہ وہ تمام صفات کسی ایک جامع مضمون میں مشترک ہیں۔ مثلاً العزیز الغفار، العزیز الرحیم، العزیز الحکیم اور العزیز العلیم میں صفات الغفار، الرحیم، الحکیم اور العلیم صفت العزیز کے مقابل آئی ہیں۔ ان سب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ سب فی الحقیقت ایک ہی صفت کے مختلف پہلو ہیں۔ رحمت و مغفرت ایک ہی صفت کے دو رخ ہیں۔ حکمت علم سے آتی ہے اور اس کا تعلق رحمت سے بھی ہے گویا یہ تمام صفات ایک ہی منبع سے پھوٹتی ہیں۔ دوسری طرف علم بھی قدرت کا تقاضا ہے اور قدرت کا اظہار صفت العزیز سے ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن مختلف صفات کی وحدانیت کی دلیل بھی بن جاتا ہے۔

تالیفات امام حمید الدین فراہی

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	..-..
۲۔ اقسام القرآن	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے	۵-۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد)	۶۹۰-۰۰
فی جلد :	۱۱۰-۰۰
۲۔ مبادی تدبر قرآن	۳۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین	..-..
۴۔ اسلامی ریاست	..-..
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام	۴-۰۰
۷۔ تنقیدات	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۲۵-۰۰
: جلد دوم	..-..
۱۰۔ مبادی تدبر حدیث	..-..
۱۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار	۲۳-۰۰
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۳۶-۰۰
۱۳۔ حقیقت شرک و توحید	۵۶-۰۰
۱۴۔ حقیقت نماز	۱۸-۰۰
۱۵۔ حقیقت تقویٰ	۱۸-۰۰

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور — ۵۴۶۰۰ — پاکستان۔ فون ۷۵۴۳۴۰۲